ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی امتیازی آراء

انجینئر نوید احمد

ڈاکٹر اسرار احمدؒ نہ صرف ایک عظیم مفکّرِ قرآن تھے بلکہ نوعِ انسانی کے بہت بڑے خیر خواہ اور بالخصوص اُمّتِ مسلمہ کے لیے ایک عظیم مصلح تھے۔ اُنہوں نے تحریر و تقریر کے ذریعے لوگوں میں قرآن کی طرف راغب ہونے کا احساس پیدا کیا' قرآن فہمی کے حوالے سے بعض نکات کو نئی تعبیرات کے ذریعے واضح کیا اور اُمت کے درمیان بعض علمی و فکری نزاعات کے حل کے لیے امتیازی آراء پیش کیں۔ البتہ کوئی بھی نئی رائے پیش کرنے کے حوالے سے کسی بھی فتنہ کے اندیشہ سے وہ آگاہ تھے' لہٰذا اِس کے تدارک کے لیے انہوں نے یہ اصول طے کیا کہ عقائد و اعمال کے حوالے سے ہمیں بہر صورت اسلاف سے چمٹے رہنا ہے۔ اِس اصول کو یوں تحریر کیا:

> ''دین کا جو عملی پہلو ہے اس میں پیچھے سے پیچھے جایئے۔ یہاں یہ دلیل نہیں چلے گی کہ جدید دَور کے تقاضے کچھ اور ہیں' جبکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے کیا کیا۔ اس حوالے سے قرآن کے طالب علم کا رُخ پیچھے کی طرف ہونا چاہیے کہ اسلاف نے کیا سمجھا۔ متأخرین کو چھوڑ کر متقدمین کی طرف جایئے۔ متقدمین سے تبع تابعین' پھر تابعین سے ہوتے ہوئے ''مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ'' یعنی حضور ﷺ اور صحابہؓ کے عمل تک پہنچیے۔ اس اعتبار سے اقبال کا یہ شعر صحیح منطبق ہوتا ہے ؎
>
> بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
> اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی ست!
>
> دین کا عملی پہلو وہی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ اس میں اگرچہ روایات کے اختلاف کی وجہ سے کچھ فرق ہو جائے گا مگر دلیل یہی رہے گی: ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ))[1] ''نماز اِس طرح پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو''۔ اب نماز کی جزئیات کے بارے میں روایات میں کچھ فرق ملتا ہے۔ کسی کے نزدیک ایک روایت قابل ترجیح ہے' کسی کے نزدیک دوسری۔ اس اعتبار سے جزئیات

میں تھوڑا بہت فرق ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔البتہ دلیل یہی رہے گی کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل یہ تھا۔حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی نوٹ کر لیجیے:
((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ))(۲) ''تم پر میری سنت اختیار کرنا لازم ہے اور میرے خلفاءِ راشدین کی سنت جو ہدایت یافتہ ہیں''۔ چنانچہ حضور ﷺ کا عمل اور خلفاء راشدین کا عمل ہمارے لیے لائق تقلید ہے۔ پھر اسی سے متصل وہ چیزیں ہیں جن پر ہماری چودہ سو برس کی تاریخ میں اُمت کا اجماع رہا ہے۔اب دنیا اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ قرار دے کر ہم پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی ہے اور ہمیں بنیاد پرست (Fundamentalist) کی گالی دے کر چاہتی ہے کہ ہمارے اندر معذرت خواہانہ رویہ پیدا کر دے' مگر ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ان باتوں سے قطعاً متاثر ہوئے بغیر دین کے عملی پہلو کے بارے میں پیچھے سے پیچھے جاتے ہوئے ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ تک پہنچ جائیں!''(۳)

گویا ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد امتیازی آراء پیش کر کے کوئی انتشارِ ذہنی پیدا کرنا نہیں تھا بلکہ دین کے متفقہ و مسلمہ حقائق کی دورِ حاضر کی عقلی سطح پر جدید تعبیر کرنا درامت کے درمیان نزاعی معاملات میں افہام و تفہیم کی صورت پیدا کرنا تھا۔اس حوالے سے اُن کی بعض امتیازی آراء ذیل میں بیان کی جا رہی ہیں:

(۱) مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کی بلیغ وضاحت

قرآنِ حکیم کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾﴾ (الطارق)

''بے شک وہ فیصلہ کن کلام ہے۔وہ ہرگز بے مقصد بات نہیں۔''

گویا اب قوموں کی دنیا اور آخرت میں عزت و ذلت کا فیصلہ قرآن سے تعلق کی کیفیت پر ہوگا۔دنیا کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّ يَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ))(۴)

''بے شک اللہ اس کتاب کے ذریعے قوموں کو عروج دے گا اور اسے چھوڑنے کی وجہ سے ذلیل کر دے گا۔''

اور آخرت کے بارے میں آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ))(۵)

''قرآن تیرے حق میں گواہ بنے گا یا تیرے خلاف۔''

گویا قرآنِ حکیم کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنا ہماری دنیا و آخرت کی کامیابی کے لیے اہم ترین عمل ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو یوں واضح کیا:

''ہمارا اصل کام یہ ہے کہ پوری دیانت داری کے ساتھ پہلے یہ سمجھیں کہ اس کتاب مبارک کے کیا حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ پھر یہ دیکھیں کہ آیا ہم انہیں ادا کر رہے یا نہیں۔ اگر یہ معلوم ہو کہ ایسا نہیں ہے تو پھر یہ سوچیں کہ ان کی ادائیگی کی کیا صورت ممکن ہو سکتی ہے اور پھر بلا تاخیر اِس کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔ اس لیے کہ اس کا براہِ راست تعلق ہماری عاقبت اور نجات سے ہے اور اس معاملے میں کسی کوتاہی کی تلافی قرآن حکیم کی شان میں قصیدے پڑھنے سے بہر حال نہیں ہو سکتی۔''(۶)

ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں پر قرآنِ مجید کے حقوق واضح کرنے کے لیے ۱۹۶۸ء میں کئی مقامات پر خطابات کیے جنہیں بعد میں انہوں کتابی صورت میں تحریر کیا۔ ان خطابات کی وجہ یہ بنی کہ جب ۱۹۶۸ء میں صدر ایوب خان کے دور اقتدار کے دس برس مکمل ہوئے تو اس کی خوشی میں پورے ملک میں سرکاری سطح پر مختلف عنوانات کے تحت ''جشن'' منائے گئے' مثلاً جشنِ خیبر اور جشنِ مہران وغیرہ۔ اسی سلسلہ ہائے جشن میں ایک اضافہ ''جشنِ نزولِ قرآن'' کا بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے حکومت کی اس سرگرمی پر شدید ردعمل کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''آپ کو معلوم ہے کہ آج کل ہمارے ملک میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر ''نزولِ قرآن مجید کا چودہ سو سالہ جشن'' منایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں دو باتیں سمجھ لینے کی ہیں۔

ایک یہ کہ اس قسم کی نئی نئی تقریبات کی ایجاد و ترویج ہمارے دین کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی۔ ہمیں اپنے تمام دینی جذبات کے اظہار کے لیے صرف ان تقریبات پر اکتفاء و قناعت کرنا چاہیے جو حضور نبی اکرم ﷺ سے ماثور چلی آ رہی ہیں۔ ان میں نت نئے اضافوں سے دین میں بدعت کا دروازہ کھلتا ہے' جس سے بے شمار خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ آنحضور ﷺ کا یہ فرمان مبارک ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے کہ:

((وَشَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ))(۷)

''سب سے برے کام وہ ہیں جو دین میں نئے ایجاد کر لیے جائیں۔ ایسا ہر کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی و ضلالت ہے۔''

موجودہ سلسلۂ تقریبات کے ساتھ لفظ ''جشن'' بھی خاص اہمیت کا حامل ہے' اس سے

ذہن خواہی نخواہی جشنوں کے اس سلسلے کی جانب منتقل ہو جاتا ہے جو خیبر سے کراچی تک مختلف علاقائی ناموں سے منائے جا رہے ہیں اور جن میں اس نام نہاد ثقافت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے جو قرآن مجید کی تعلیمات پر ایک کھلا طنز ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الحاد پسند اور اباحیت پرست لوگوں کے لیے اس قسم کے بے شمار جشنوں کے اہتمام کے ساتھ جشنِ نزولِ قرآن مجید کا انعقاد غالباً ایک رشوت ہے جو مذہبی ذوق رکھنے والے لوگوں کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ واللہ اعلم!

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس قسم کی تقریبات سے اگر یہ فائدہ اٹھایا جائے کہ ان کے ذریعے عوام میں دین و مذہب سے لگاؤ پیدا ہو' قرآن حکیم کے ساتھ ان کا ربط و تعلق بڑھے اور اس بعد میں کمی ہو جو آج ہمارے اور قرآن مجید کے مابین پیدا ہو گیا ہے' تو پھر بھی ان کے انعقاد کے جواز کا کوئی پہلو شاید پیدا کیا جا سکے' لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اس قسم کا کوئی فائدہ اس نوعیت کی تقاریب سے حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن کی تزئین و آرائش یا حسنِ قراءت کے مظاہروں اور مقابلوں سے تو بہرحال اس قسم کے کسی فائدے کے حصول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو کانفرنسیں یا جلسے قرآن مجید کے نام پر منعقد ہوتے ہیں ان میں بھی اکثر سارا زور قرآن مجید کے مقام و مرتبہ کی وضاحت یا اس کی شان کے بیان پر صرف کر دیا جاتا ہے اور اس بات کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے کہ ہم پر بحیثیت مسلمان قرآن مجید کے کیا کیا حقوق عائد ہوتے ہیں اور ان کی ادائیگی کی کیا صورت ممکن ہے!''(۸)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک مسلمان پر قرآنِ مجید کے حقوق اس طرح بیان کیے:

''ثقیل الفاظ یا دینی اصطلاحات سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے عام زبان میں بیان کیا جائے تو قرآن مجید کے یہ پانچ حقوق ہر مسلمان پر عائد ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ اسے مانے۔ (ایمان و تعظیم)

دوسرے یہ کہ اسے پڑھے۔ (تلاوت و ترتیل)

تیسرے یہ کہ اسے سمجھے۔ (تذکّر و تدبّر)

چوتھے یہ کہ اس پر عمل کرے۔ (حکم و اقامت)

اور پانچویں یہ کہ اسے دوسروں تک پہنچائے۔ (تبلیغ و تبیین)''(۹)

مذکورہ بالا حقوق کی تفصیلی وضاحت کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے خبردار کیا:

''حضرات! یہ ہیں قرآن مجید کے وہ حقوق جو میرے فہم کے مطابق ہم سب پر بحیثیتِ

مسلمان عائد ہوتے ہیں اور جن کی ادائیگی کی فکر ہمیں کرنی چاہیے۔ ہم وہ خوش قسمت قوم ہیں جس کے پاس اللہ کا کلامِ پاک مِن وعَن محفوظ اور موجود ہے۔ یہ بات جہاں بڑے اعزاز کا باعث ہے وہیں اس کی بنا پر ایک بہت بڑی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ ہم سے پہلے کتابِ الٰہی کے حامل بنی اسرائیل بنائے گئے تھے' لیکن جب انہوں نے اس منصبِ عظیم کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا اور ثابت کر دیا کہ وہ اس اعزاز و اکرام کے لائق نہیں تو ایک دوسری اُمت برپا کر دی گئی اور اسے قرآن مجید کا حامل بنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ سورۃ الجمعہ کی آیت ۵ میں کتابِ الٰہی کے حامل ہو کر اس کے حقوق کو ادا نہ کرنے والوں کے لیے پہلے ایک مثال بیان کی گئی ہے کہ:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ﴾

''ان لوگوں کی مثال جو حامل تورات بنائے گئے' پھر نہ اٹھایا انہوں نے اس (کی ذمہ داری) کو' اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ پیٹھ پر لادے پھر رہا ہو۔''

اور پھر اس کے فوراً بعد واضح کر دیا گیا کہ ان کا طرزِ عمل آیاتِ الٰہی کی تکذیب کے مترادف ہے:

﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ﴾

''بُری ہے مثال ان لوگوں کی جو جھٹلاتے ہیں اللہ کی آیات کو۔''

اور ساتھ ہی یہ سنت اللہ بھی بیان کر دی گئی ہے کہ:

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵﴾

''اور اللہ (ایسے) ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میرا یا آپ کا شمار اللہ کے نزدیک ان لوگوں میں ہو اور دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں صحیح معنی میں قرآن کا حامل بنائے۔''(۱۰)

(۲) فرائض دینی کا واضح اور جامع تصوّر

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۲۰۸﴾ (البقرۃ)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! داخل ہو جاؤ پورے کے پورے اسلام میں اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔''

گویا جزوی اسلام پر عمل شیطان کے نقش قدم کی پیروی ہے۔ اللہ غیور ہے اور وہ ہم سے اپنی خالص اطاعت چاہتا ہے۔ سورۃ البقرۃ' آیت ۸۵ میں جزوی اطاعت کرنے والوں سے اظہارِ ناراضگی یوں کرتا ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۸۵﴾

''کیا تم کتابِ (الٰہی) کے بعض احکامات کو تو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے؟ تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں' اُن کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رُسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب میں ڈال دیئے جائیں۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے غافل نہیں ہے۔''

دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے بچنے کے لیے ہمیں علم ہونا چاہیے کہ دین اسلام ہم سے کن کن فرائض کا تقاضا کرتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نزدیک انسان کے عمل میں دو علیحدہ علیحدہ چیزیں محرک کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ ایک نیت و ارادہ اور دوسری فرائض کا صحیح شعور اور تصور۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''پہلی ضروری چیز اپنا ارادہ ہے' لیکن اتنی ہی ضروری چیز یہ ہے کہ یہ صحیح تصور بھی موجود ہو کہ دین کے حقیقی فرائض کیا ہیں! اگر فرائض کا تصور محدود یا ناقص ہو گا تو جو چیزیں کسی کو معلوم ہیں ان پر تو وہ عمل کر لے گا لیکن جو چیزیں اسے معلوم ہی نہیں ہیں' ان پر ارادے کے باوجود وہ عمل کیسے کر سکے گا؟ چنانچہ میں آج کی اس صحبت میں اس دوسری بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے دینی فرائض کا صحیح اور جامع تصور کیا ہے' تاکہ پورے دین کا مکمل نقشہ ہمارے سامنے موجود ہو اور ہم صحیح طور پر اپنا جائزہ لے سکیں کہ دین کے کتنے حصے پر ہم عمل پیرا ہیں اور کتنی چیزوں پر عمل نہیں کر رہے! اور کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جن چیزوں پر عمل ہم نے چھوڑ رکھا ہے وہی چیزیں دینی لحاظ سے اہم ترین ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مغز سرے سے موجود ہی نہ ہو اور ہم صرف چھلکا پکڑے بیٹھے ہوں!''(۱۱)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ بیان کرتے ہیں کہ از روئے قرآنِ حکیم ایک مسلمان پر تین دینی فرائض عائد ہوتے ہیں۔ پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ خود دین کے تمام انفرادی احکانات پر عمل پیرا ہو۔

دوسرا فریضہ ہے دین کی تعلیمات کو پھیلانا اور تیسرا فریضہ ہے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنا۔ پہلے فریضے کے حوالے سے وہ تحریر فرماتے ہیں:

''قرآن کا تقاضا یہ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (البقرۃ: ۲۰۸)

''اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔''

اس میں داخلہ جزوی طور پر نہیں ہوسکتا کہ کچھ احکام پر تو سرِ تسلیم خم ہے اور کچھ احکام پر عمل کرنے سے انکار و اعراض' سرتابی اور سرکشی! اس کا نام اسلام نہیں ہے۔ یہاں تو اصول یہ ہے کہ ماننا ہے تو پورا مانو' ورنہ چھوڑو اور دفع ہو جاؤ۔ (Take it all or leave it all) یہاں بیچ بیچ کی بات نہیں چلے گی۔''(۱۲)

دوسرے فریضے یعنی لوگوں تک اللہ کے دین کی تعلیمات کو واضح کرنے کے لیے لکھتے ہیں:

''سورۃ البقرۃ' آیت ۱۴۳ میں فرمایا گیا کہ ہم نے جو تمہیں اُمت وسط یعنی بہترین اُمت بنایا ہے تو یہ اسی فریضہ شہادت علی الناس کی ادائیگی کے لیے ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی اُمت (بہترین اُمت) بنایا' تاکہ تم گواہ ہو جاؤ پوری نوع انسانی پر اور رسولؐ گواہ ہو جائیں تم پر۔''

عبادتِ ربّ کے بعد شہادت علی الناس کی یہ دوسری اہم ذمہ داری ہے جو اُمت کے سپرد کی گئی۔ اس کی نزاکت کو جان لیجیے۔ اگر رسول ﷺ بالفرض اللہ کا پیغام نہ پہنچاتے تو اللہ کے ہاں وہ مسئول اور ذمہ دار ہوتے! انہوں نے پہنچا دیا لہٰذا وہ بری ہو گئے اور باقی دنیا کو پہنچانے کی ذمہ داری اُمت کے حوالے کر کے تشریف لے گئے۔ اس لیے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ پوری نوعِ انسانی کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے' صرف عرب کے لیے تو نہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سبا:۲۸) اور: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ (الاعراف:۱۵۸) اور: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیاء) ـــــ باقی دنیا کو کون پہنچائے گا؟ اس کے متعلق میں عرض کر چکا کہ حجۃ الوداع میں آنحضور ﷺ نے فرما دیا کہ اب یہ کام تمہارے ذمے ہے۔ میں نے تمہیں پہنچا دیا' اب تم ان کو پہنچاؤ جو یہاں نہیں ہیں۔

یہاں یہ بات مزید سمجھ لیجیے کہ یہ صرف اُس وقت کی دنیا والوں کا معاملہ نہیں تھا۔ اب تو دائمی رسالتِ محمدی کا دَور ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔ اب تا قیامِ قیامت بنی نوعِ انسان کے لیے شہادت علی الناس کی ذمہ داری کون ادا کرے گا؟ یہ ذمہ داری اُمتِ محمد کی ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔ اگر اُمت یہ فریضہ ادا نہیں کرتی تو جان لیجیے کہ دنیا کی گمراہی کا وبال اُس کے سر آئے گا۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا اُمتی ہونے سے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی کریڈٹ مل جائے گا! میں آپ کو دوسرا رُخ دکھا رہا ہوں۔ یہ تو اتنی بڑی ذمہ داری ہے کہ اگر آپ اسے ادا نہیں کرتے تو دنیا کی ضلالت اور گمراہی کا وبال بھی آپ کے ذمہ آئے گا۔ بنی نوع انسان عدالتِ اُخروی میں یہ عذر پیش کرنے میں بڑی حد تک حق بجانب ہوں گے کہ اے اللہ! ان کے پاس تیری آخری اور مکمل کتاب تھی' ان کے پاس تیرا دین تھا' یہ تیری شریعت کے علمبردار تھے' یہ تیرے آخری نبی اور رسول ﷺ کے اُمتی تھے' انہوں نے اس دین کو نہ ہم تک پہنچایا اور نہ خود اس پر عمل کیا۔ یہ تیری آخری کتاب اور آخری نبی ﷺ کی تعلیمات پر خزانے کے سانپ بن کر بیٹھے رہے۔''(۱۳)

تیسرے فریضے یعنی دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''فرمایا گیا:

﴿اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ﴾ (الشوریٰ:۱۳)

''دین کو قائم کرو اور اس بارے میں تفرقے میں نہ پڑو۔''

قائم کون سی چیز کو کہتے ہیں؟ اس کو جو کھڑی ہو۔ زمین پر پڑی ہوئی چیز تو قائم نہیں کہلاتی۔ کوئی چیز گر جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس کو قائم کرو' اسے کھڑا کرو۔ دین اگر پہلے سے قائم ہے تو اسے قائم رکھنا اہل دین کی ذمہ داری ہوگی اور اگر زمین بوس ہو تو اس کا اپنے ماننے والوں سے یہ تقاضا ہے کہ اسے قائم کریں' اسے کھڑا کریں۔ اسی دین کے مطابق نظامِ معیشت و معاشرت استوار ہو' اسی کے مطابق نظامِ حکومت و سیاست قائم ہو۔ اگر یہ صورت ہے تو ''اَقِیْمُوا الدِّیْنَ'' کا تقاضا پورا ہو رہا ہے' اور اگر نہیں تو جان لیجیے کہ محض تلاوت اور مدح سرائی کے لیے تو یہ دین نہیں اُتارا گیا۔ دیکھئے سورۃ المائدۃ' آیت ۶۸ میں فرمایا:

﴿قُلْ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾

''(اے نبی ﷺ! صاف صاف) کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم تورات اور انجیل کو اور دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے ربّ کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔''

یہاں وہی لفظ اقامت (قائم کرنا) آیا ہے۔ اب اس آیت میں بغرضِ تفہیم ''یَا اَھْلَ الْکِتَابِ'' کی جگہ ''یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ'' اور ''تورات وانجیل'' کی جگہ ''قرآن'' رکھ دیجیے تو بات یوں ہوگی: یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حتّٰی تُقِیْمُوا الْقُرْاٰنَ کہ اے اہل قرآن' اے حاملانِ کتاب اللہ! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے جب تک تم قرآن کو قائم نہ کرو۔ قرآن حکیم اگر واقعی ضابطہ حیات ہے' جیسا کہ فی الواقع وہ ہے' تو اس کو نافذ کیا جانا چاہیے۔ قرآن نے اگر کوئی نظام دیا ہے' اور واقعی دیا ہے' تو وہ نظام قائم ہونا چاہیے۔''(۱۴)

دینی فرائض واضح کرنے کے بعد ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ان فرائض کی ادائیگی کے لیے تین لازمی تقاضے بیان کیے ہیں۔ وہ مثال دیتے ہیں کہ نماز ادا کرنا فرض ہے لیکن اس کے لیے وضو کرنا لازمی تقاضا ہے۔ اسی طرح دینی فرائض بھی ادا نہیں ہو سکتے جب تک کہ تین لازمی تقاضے پورے نہ کیے جائیں۔ تحریر فرماتے ہیں:

''پہلے لازمی تقاضے کو سادہ الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہوگا کوشش اور کشاکش۔ غور کیجیے کہ کوشش اور محنت کیے بغیر کیا یہ منزلیں سر ہو سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں! بلکہ محض کوشش اور محنت سے بھی کام نہیں بنتا' اس لیے کہ یہاں خلا تو ہے نہیں۔ آپ اگر اپنے نظریات کے مطابق کوشش کر رہے ہیں تو اور لوگ بھی تو ہیں جو اپنے نظریات کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ لہٰذا کوشش' کوشش سے ٹکرائے گی۔ جب کوششیں باہم ٹکراتی ہیں تو اس کا نام ہوتا ہے کشاکش' جسے عام طور پر کشمکش بھی کہا جاتا ہے۔ اس کشاکش یا کشمکش کے لیے دینی اصطلاح ''جہاد'' ہے۔ یہ جہاد وہ پہلا لازمی عمل ہے کہ اگر یہ ہوگا تو دین کے وہ تین بنیادی فرائض پورے ہوں گے جو ہمارے سامنے آئے' ورنہ نہیں۔''(۱۵)

''دوسرا لازمی تقاضا التزامِ جماعت ہے۔ کون ہے جو بقائمیٔ ہوش وحواس یہ کہہ سکے کہ یہ کام انفرادی طور پر ہو سکتے ہیں؟ کوئی ایک بھی سلیم العقل شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ رائے رکھتا ہو کہ ان کاموں کے لیے جماعت ضروری نہیں۔ اگر یہ اُمور یعنی عبادتِ ربّ' اطاعتِ ربّ' شہادت علی الناس' امر بالمعروف' نہی عن المنکر' اقامتِ دین اور اظہارِ دین الحق علی الدین کلہ فرائض دینی ہیں تو ان کے لوازم کا شمار بھی فرائض میں ہوگا' کیونکہ جو شے فرض کی ادائیگی کے لیے لازمی ہو وہ بھی فرض ہے (مقدمۃ الواجب

واجب)۔مثلاً نماز پڑھنا فرض ہے اوراس کے لیے وضو شرط ہے تو وضو بھی فرض ہوا کہ نہیں؟ حج یا عمرہ کی ادائیگی کے لیے احرام شرط ہے تو احرام بھی فرض ہوا کہ نہیں؟ لہٰذا التزامِ جماعت بھی لازم و واجب ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا حکم ہے' جسے حضرت حارث الاشعری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے:

((اَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰهُ اَمَرَنِیْ بِهِنَّ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ)) (۱۶)

''(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں' اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے: التزامِ جماعت کا' (امیر کا حکم) سننے اور ماننے کا' ہجرت کا' اور اللہ کے راستے میں جہاد کا!''

ہجرت کیا ہے؟ یہ کہ ہر اُس چیز کو چھوڑ دینا جو اللہ کو پسند نہ ہو —— جیسے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَیُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ؟ تو آپؐ نے جواب دیا: ((اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ)) (۱۷) —— یہاں تک کہ وقت آئے اور گھر بار اور وطن چھوڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی انسان ہر دم آمادہ رہے۔ اور یہ ہجرت کی چوٹی ہے۔ جیسے جہاد کی چوٹی قتال فی سبیل اللہ ہے اسی طرح ہجرت کی چوٹی اللہ کے دین کے لیے ترکِ وطن ہے۔ رہا جہاد فی سبیل اللہ تو اس کا آغاز مجاہدہ مع النفس سے ہوتا ہے اور اس کی چوٹی اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال ہے۔ اور سب سے پہلی چیز جس کا اس حدیث میں حکم دیا گیا وہ التزامِ جماعت ہے۔ یہ ہے التزامِ جماعت کی فرضیت!''(۱۸)

''یہ بات بھی جان لیجیے کہ اس جماعت کا نظام ٹھیٹھ اسلامی اصول ''سمع وطاعت'' پر ہونا چاہیے' جس کا حکم بھی مذکورہ بالا حدیث میں ''بِالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ'' کے الفاظ میں آیا ہے۔ اگر آپ ایسی کسی جماعت میں شامل نہیں ہیں تو دین کے یہ تقاضے گویا آپ کے سامنے ہی نہیں ہیں۔''(۱۹)

''دینی فرائض کے لوازم میں سے تیسری چیز یہ ہے کہ اس جماعت کا جو نظام قائم ہو وہ بیعت پر مبنی ہو۔ یہ وہ واحد نظام ہے جو ہمیں کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنے سے ملتا ہے۔ کتاب وسنت میں مجھے اس کے سوا کوئی دوسرا نظام نہیں ملا اور نہ کوئی مجھے آج تک بتا سکا۔ اب یہ بات سمجھئے کہ یہ بیعت ہے کیا! ایک شخص سے ان فرائض کی ادائیگی کے ارادے سے شخصی تعلق قائم کرنا' اس کے ہاتھ پر ان فرائض کی انجام دہی کے لیے قول وقرار کرنا بیعت ہے۔ میں نے شروع ہی میں لفظ ''مرید'' کی وضاحت کر دی تھی کہ مرید وہ ہے جو ارادہ کرے۔ یعنی ایسا فرد جو اپنی اصلاح کے ارادے سے کسی کے

ہاتھ پر قول وقرار کے لیے بیعت کر لے۔ چنانچہ شخصی اصلاح اور تزکیۂ نفس کے لیے بیعت کی جاتی ہے۔ اور یہ بیعت اسلام' اطاعت' تقویٰ اور عبادت کے تقاضوں اور مطالبوں پر پورا اترنے کے لیے کسی مردِ صالح کے ہاتھ پر ہوتی ہے۔ یہ بیعت ''بیعت توبہ'' یا ''بیعت ارشاد و تزکیہ'' کہلاتی ہے' اور جب اللہ کے دین کی تبلیغ و دعوت' دین کی نشر و اشاعت' شہادت علی الناس اور اقامتِ دین جیسے عظیم فرائض کی ادائیگی اور اس کے لیے سمع و طاعت پر مبنی جماعت کے قیام اور ہجرت و جہاد کا مرحلہ درپیش ہو تو اس کے لیے بھی ایسے شخص کے ہاتھ پر جو اِس کام کا عزم لے کر اُٹھا ہو' شخصی بیعت ہو گی اور یہ بیعت ''بیعتِ جہاد'' کہلائے گی۔''(۲۰)

(۳) مسلمان خواتین کے دائرۂ کار اور ذمّہ داریوں کا معتدل انداز میں تعین

ڈاکٹر اسرار احمدؒ بیان کرتے ہیں کہ از روئے قرآنِ حکیم مسلمانوں کے دینی فرائض کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل ہے خود دین کے ہر انفرادی حکم پر عمل کرنا۔ دوسری منزل ہے دین کی تعلیمات کو پھیلانا اور تیسری منزل ہے دین کو قائم کرنے کی جدّوجہد کرنا۔ البتہ دینی فرائض کے تصور کے حوالے سے ایک توازن پیش نظر رہنا چاہیے' جس پر ڈاکٹر صاحب یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''دینی فرائض کے جامع تصور کی اہمیت یہ ہے کہ اگر انسان کو یہ معلوم نہ ہو کہ میرا رب مجھ سے کیا چاہتا ہے اور میرے دین کا مجھ سے کیا مطالبہ ہے تو وہ ان دینی فرائض کی ادائیگی کے قابل نہ ہو سکے گا جو اس پر عائد ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر فرائض دینی کے بارے میں ہمارا تصور ناقص یا نامکمل ہو' یعنی بعض فرائض تو معلوم ہوں اور انہیں ہم ادا بھی کر رہے ہوں' لیکن بعض فرائض کا ہمیں علم ہی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ ہم ادا نہیں کر سکیں گے۔ اس طرح اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ اگرچہ اپنی جگہ ہم یہ سمجھ رہے ہوں کہ ہم نے تو اپنے تمام فرائض ادا کیے ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہاں ہمیں بتایا جائے کہ تمہاری ذمہ داریاں صرف وہی نہیں تھیں کہ جو تم نے پوری کی ہیں بلکہ مزید بھی تھیں' اور ان کے ضمن میں چونکہ ہمیں علم ہی حاصل نہیں تھا' لہٰذا ان سے متعلق ہماری کارگزاری صفر ثابت ہو اور ہم اپنے تمام تر خلوص اور محنت کے باوجود ناکام قرار پائیں۔

اس مسئلے کا ایک دوسرا رُخ بھی قابل توجّہ ہے' جو خواتین کی ذمّہ داریوں کے ضمن میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک دوسرا امکان یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ذمے خواہ مخواہ ایسی ذمّہ داریاں لے لیں جو ہمارے دین نے ہم پر عائد نہ کی ہوں۔ یہ بات بھی اتنی ہی خطرناک' مضر اور نقصان دہ ہے جتنی کہ پہلی بات۔ کیونکہ انسان کا

جذبۂ عمل بسا اوقات حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو وہ غلط رخ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی بہت اہم مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً نیکی کا جذبہ ہی دنیا میں رہبانیت جیسے خلافِ فطرت نظام کو وجود میں لانے کا سبب بنا' جس نے بالآخر ایک برائی کی شکل اختیار کر لی اور بہت سے منکرات کو جنم دیا اور اس کے نتائج بہت ہی منفی اور خوفناک ہوئے۔''(۲۱)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نزدیک مردوں اور خواتین کے دینی فرائض میں فرائض کی تینوں منازل کے اعتبار سے فرق ہے۔ پہلی منزل کے بارے میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

''پہلی منزل کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سطح پر عورتوں اور مردوں کے فرائض یکساں ہیں' اگر کوئی فرق ہے تو وہ بہت ہی معمولی ہے۔''(۲۲)

''اس ضمن میں مرد و عورت کے فرائض میں جو معمولی سا فرق ہے' اس کے لیے میں آپ کے سامنے نماز کی مثال رکھ رہا ہوں۔ مردوں کے لیے حکم ہے کہ وہ مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کریں' اِلّا یہ کہ کوئی عذر ہو' جبکہ خواتین کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان کے لیے فرمایا گیا ہے کہ عورت کی نماز مسجد کے مقابلے میں اپنے گھر میں افضل ہے۔ گھر میں بھی صحن کے مقابلے میں دالان میں' اور دالان کے مقابلے میں کسی کمرے کے اندر افضل ہے' اور کمرے کے اندر بھی اگر کوئی کوٹھڑی ہے (جیسا کہ پہلے زمانے میں بنائی جاتی تھیں) تو اس میں نماز ادا کرنا افضل ترین ہے۔''(۲۳)

ڈاکٹر صاحبؒ نے مَردوں اور خواتین کے دینی فرائض اور ان کی ادائیگی کے دائرہ کار میں فرق کا سبب اس طرح واضح کیا:

''یہ پہلی منزل ہے' جہاں پر دینی ذمہ داریوں کے اعتبار سے مرد و عورت میں بہت معمولی فرق ہے' لیکن جیسے جیسے ہم اوپر چلتے جائیں گے یہ فرق بڑھتا چلا جائے گا۔ پہلی منزل پر یہ فرق بہت تھوڑا ہے' دوسری منزل پر بہت نمایاں ہے' جبکہ تیسری منزل پر جا کر یہ فرق بہت بڑھ جائے گا۔ ہمیں اس فرق کی اساس کو سمجھ لینا چاہیے۔ اسلام شرم و حیا اور عصمت و عفت کی انتہائی اہمیت بیان کرتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے میں ان چیزوں کی خوب حفاظت ہو۔ یہی وہ اصول اور مقصد ہے جس کے تحت ستر و حجاب اور لباس کے احکام دیے گئے اور اس معاملے میں مرد و عورت کے مابین فرق رکھا گیا۔''(۲۴)

''پہلی منزل پر بھی جو فرق ہے وہ اسی بنیاد پر ہے کہ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ مردوں اور عورتوں کے مابین بلاضرورت کوئی اختلاط یا آپس میں ملنا جلنا ہو۔ چنانچہ اسلام دونوں کے علیحدہ علیحدہ دائرۂ کار قائم کرتا ہے اور دونوں کی ذمہ داریاں اور فرائض کا علیحدہ

علیحدہ تعین کرتا ہے۔ نماز کے ضمن میں آخر یہ فرق کیوں کیا گیا کہ مردوں کی نماز گھر کی نسبت مسجد میں افضل ہے' جبکہ عورت کی نماز گھر کے اندر اور گھر کی بھی اندرونی کوٹھڑی میں زیادہ افضل ہے اور مسجد میں ان کی آمد پسندیدہ نہیں ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ اس میں اختلاط کا ایک امکان پیدا ہوتا ہے۔ راستہ چلتے' مسجد کو آتے جاتے مردوں سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔ مسجد کے اندر بھی خواہ کتنا ہی اہتمام کر لیا جائے مگر اس کا اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں کوئی بے حجابی کی کیفیت نہ پیدا ہو جائے یا کسی نامحرم کی نظر نہ پڑ جائے۔''(۲۵)

ڈاکٹر صاحبؒ کے نزدیک فرائض دینی کی دوسری منزل پر خواتین کی ذمہ داریوں کا دائرۂ کار مردوں کی نسبت محدود ہے۔ اس کی وضاحت ڈاکٹر صاحبؒ یوں پیش کرتے ہیں:

''دوسری منزل پر دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری ہے..... اس کے ضمن میں ہمارے دین نے جو عام ترتیب سکھائی ہے وہ یہ ہے کہ ''**الاقربُ فالأقرب**'' کے اصول پر اصلاح کا کام پہلے اپنے آپ سے شروع کیا جائے' پھر گھر والوں کی اصلاح کی فکر کی جائے اور اس کے بعد دوسرے لوگوں پر دعوت و تبلیغ کا کام کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص سات سمندر پار جا کر تبلیغ کر رہا ہو' جبکہ اس کے اپنے گھر میں دین کا معاملہ تسلی بخش نہ ہو تو یہ درحقیقت غلط ترتیب ہے' جس کی وجہ سے وہ برکات ظاہر نہیں ہوتیں جو نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی تبلیغ سے ظاہر ہوئیں۔

اب اس ترتیب کو سامنے رکھیں تو ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خواتین کے لیے دعوت' تبلیغ' نصیحت اور اصلاح کا اوّلین دائرہ ان کا اپنا گھر ہے۔ ان کے اپنے بچوں کی تعلیم' تربیت اور اصلاح کلیتًا ان کی ذمہ داری ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر خواتین کا حلقہ اور اس سے مزید آگے محرم مَردوں کا حلقہ آئے گا۔ بس ان تین حلقوں میں خواتین کو دعوت و تبلیغ کے فرائض سرانجام دینے ہیں۔''(۲۶)

''جہاں تک دوسرے دائرے یعنی گھر سے باہر نکل کر دوسری خواتین میں دعوت و تبلیغ اور درس و تدریس کا تعلق ہے تو میرے خیال میں اس کے لیے منظم کوشش وقت کی اہم ضرورت ہے۔ البتہ اس کے لیے ایسی خواتین کو زیادہ فعال ہونا چاہیے جو ادھیڑ عمر کی ہیں' اور ان کے لیے حجاب کے احکامات میں بھی وہ شدت نہیں ہے۔ بڑی عمر کی خواتین کے لیے سورۃ النور' آیت ۶۰ میں فرمایا گیا: ﴿فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ﴾ کہ ان پر کوئی حرج نہیں اگر وہ اپنی اضافی چادریں اتار کر رکھ بھی دیا کریں! یعنی ستر کی شدت تو برقرار رہے گی مگر پردے اور حجاب کے ضمن میں ان پر اب وہ شدید

پابندیاں نہیں ہیں جو ایک نوجوان عورت پر ہیں۔''(۲۷)

فرائض دینی کی تیسری منزل پر آکر ڈاکٹر صاحبؒ کے نزدیک مردوں اور خواتین کی ذمہ داریوں میں فرق بہت نمایاں ہوجاتا ہے۔اس فرق کو ڈاکٹر صاحبؒ نے یوں بیان کیا:

''اب آیئے تیسری منزل کی طرف۔ یہ اقامت دین' اسلامی انقلاب یا تکبیر رب کی منزل ہے۔اس سطح پر ایک ایسی منظّم جماعت کی تشکیل ناگزیر ہے جس کی حیثیت ایک بنیانِ مرصوص کی ہو اور جو باطل نظام کی تبدیلی کے لیے نہ صرف یہ کہ ایک عوامی تحریک برپا کرسکے' بلکہ قتال فی سبیل اللہ کے کٹھن اور جاں گسل مراحل سے گزرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہو۔لیکن یہ وہ ذمہ داری ہے جس سے انتہائی ناگزیر حالات اور ہنگامی صورت حال کے سوا اللہ نے خواتین کو بری کیا ہے۔''(۲۸)

''اللہ تعالیٰ نے فریضہ اقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد مردوں پر فرض کی ہے اور عورتوں پر بھی یہ ذمہ داری براہ راست عائد نہیں کی۔البتہ خواتین سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اس جدوجہد میں اپنے مردوں کی معین و مددگار رہوں۔بچوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت کو اپنی ذمہ داری سمجھیں اور مردوں پر اس کا زیادہ بوجھ نہ پڑنے دیں۔ وہ مردوں کے لیے اس راہ میں زیادہ سے زیادہ وقت فارغ کرنا ممکن بنائیں۔اُن پر اپنی فرمائشوں کا بوجھ اس طرح نہ لاد دیں کہ وہ انہی مسائل میں اُلجھ کر رہ جائیں اور دین کی سربلندی کے لیے جُہد وکوشش نہ کرسکیں۔ خواتین اگر ان امور کو مدّنظر رکھتے ہوئے شوہروں سے تعاون کریں تو یہ ان کی طرف سے اقامت دین کی جِدّوجُہد میں شرکت کا بدل بن جائے گا اور ان کے لیے اجرِ کثیر اور ثوابِ عظیم کا باعث ہوگا۔اور خواتین کے لیے اس سے بڑھ کر خوش آئند بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ انہیں گھر بیٹھے بٹھائے مردوں کے برابر اجر وثواب مل جائے!!''(۲۹)

اپنے موقف کے حق میں دلیل کے طور پر ڈاکٹر صاحبؒ نے ایک انصاریہ خاتون حضرت اسماءؓ بنت یزید کی نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ایک گفتگو کو نقل کیا ہے:

''وہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ مجھے عورتوں کی ایک جماعت نے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے۔وہ سب کی سب وہی کہتی ہیں جو میں عرض کرتی ہوں اور سب وہی رائے رکھتی ہیں جو میں آپ ﷺ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔عرض یہ ہے کہ:

''آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

چنانچہ ہم آپ ﷺ پر ایمان لائیں اور ہم نے آپ ﷺ کی پیروی کی۔ لیکن ہم عورتوں کا حال یہ ہے کہ ہم پردوں کے اندر رہنے والیاں اور گھروں کے اندر بیٹھنے والیاں ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ مرد ہم سے اپنی خواہش پوری کرلیں اور ہم ان کے بچے لادے لادے پھریں۔ مرد جمعہ و جماعت' جنازہ و جہاد ہر چیز کی حاضری میں ہم سے سبقت لے گئے۔ وہ جب جہاد پر جاتے ہیں تو ہم ان کے گھر بار کی حفاظت کرتی ہیں اور ان کے بچوں کو سنبھالتی ہیں۔ تو کیا اجر میں بھی ہم کو ان کے ساتھ حصہ ملے گا؟''

آنحضور ﷺ نے ان کی یہ فصیح و بلیغ تقریر سننے کے بعد صحابہؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

''کیا آپ لوگوں نے اس سے زیادہ بھی کسی عورت کی عمدہ تقریر سنی ہے' جس نے اپنے دین کی بابت سوال کیا ہو؟'' تمام صحابہؓ نے قسم کھا کر اقرار کیا کہ نہیں یا رسول اللہ ﷺ!

اس کے بعد آنحضرت ﷺ حضرت اسماءؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

''اے اسماء! میری مدد کرو اور جن عورتوں نے تمہیں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے ان تک میرا یہ جواب پہنچا دو کہ تمہارا اچھی طرح خانہ داری کرنا' اپنے شوہروں کو خوش رکھنا اور ان کے ساتھ سازگاری کرنا مردوں کے ان سارے کاموں کے برابر ہے جو تم نے بیان کیے ہیں۔''

حضرت اسماءؓ رسول اللہ ﷺ کی یہ بات سن کر خوش خوش اللہ کا شکر ادا کرتی ہوئی واپس لوٹ گئیں اور انہوں نے اس پر کسی انقباض کا اظہار نہیں کیا۔''(۳۰)

(۴) جہاد فی سبیل اللہ کے حوالے سے مغالطوں کا ازالہ

روزِ قیامت دردناک عذاب سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم جان اور مال سے جہاد فی سبیل اللہ کریں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱﴾ (الصف)

''اے ایمان کے دعوے دارو! کیا میں تمہاری رہنمائی کروں اس کاروبار کی طرف جو تمہیں عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر (جیسے کہ ایمان لانے کا حق ہے) اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم واقعتاً صحیح علم رکھتے ہو۔''

معلوم ہوا کہ از روئے قرآن جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر نجات کا کوئی امکان نہیں' کیونکہ اس آیت میں جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر نجات کی نفی ہو رہی ہے۔

صدیوں کے انحطاط کے نتیجے میں جہاں بحیثیت اُمت ہمارے اندر عملی و اخلاقی زوال آیا وہاں دینی تصورات اور اصطلاحات بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ دینی تصورات میں محدودیت در آئی' بعض اہم دینی اصطلاحات کا مفہوم محدود ہی نہیں مسخ کر دیا گیا۔ان دینی اصطلاحات میں ایک نہایت اہم اصطلاح ''جہاد فی سبیل اللہ'' کی ہے۔اس انتہائی جامع اور ہمہ گیر دینی اصطلاح کو نہ صرف یہ کہ بہت ہی محدود معنوں میں مقید کر دیا گیا بلکہ نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھوں ''فساد فی الارض'' پر مشتمل ہوس ملک گیری کے لیے کی جانے والی قتل و خون ریزی کو بھی اس مقدس اصطلاح کا جامہ اوڑھا کر اس کی رسوائی کا سامان کیا گیا۔لہٰذا ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے حوالے سے معاشرے میں پھیلے ہوئے غلط تصورات اور مغالطوں کو دور کر کے اس مقدس اصطلاح کے حقیقی اور جامع مفہوم کو عام کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بارہا اپنے خطبات و تقاریر میں جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں مغالطوں کا ازالہ کیا' اِس کی حقیقت کو واضح اور مدلّل انداز میں بیان فرمایا اور اس کی مختلف سطحوں پر عمدگی سے روشنی ڈالی۔مغالطوں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

''جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں سب سے بڑا مغالطہ' جو بہت عام ہے اور صرف عوام ہی میں نہیں' خواص یعنی علماء کو بھی لاحق ہے' یہ ہے کہ ''جہاد'' کے معنی ''جنگ'' کے ہیں۔گویا کہ ''جہاد'' کو ''قتال'' کے مترادف یا ہم معنی قرار دے دیا گیا ہے۔غور طلب بات ہے کہ لسانیات کا یہ بنیادی اصول ہے کہ کسی بھی زبان کے دو الفاظ بالکل ایک مفہوم کے حامل نہیں ہوتے۔''(۳۱)

''جہاد اور قتال کو مترادف سمجھ لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود جہاد کو فرضِ عین کی بجائے فرضِ کفایہ سمجھ لیا گیا۔اس کے نتیجے میں جہاد کا تصور ہمارے دینی تصورات سے بحیثیت مجموعی خارج ہو گیا اور اس کی کوئی اہمیت نہ رہی۔''(۳۲)

''ایک دوسری چیز جس نے میرے نزدیک جلتی پر تیل کا کام کیا ہے اور پھر اس کی وجہ سے اصل بدنامی مسلمانوں کے حصے میں آئی ہے' یہ مغالطہ ہے کہ مسلمان جب بھی جنگ کرے وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔اس غلط فہمی کے بدترین نتائج نکلے اور اس نے جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح کو بری طرح بدنام کیا۔ظاہر بات ہے کہ ہمارے دَورِ ملوکیت

میں بادشاہ جو جنگیں کرتے تھے ان کا محرک ان کی ہوس ملک گیری ہوتی تھی تا کہ بڑے سے بڑے محل بنا سکیں اور زیادہ سے زیادہ محصولات (Revenues) اکٹھے ہو سکیں۔ لیکن ان جنگوں کو بھی جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا۔''(۳۳)

جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں مغالطوں کو واضح کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ جہاد فی سبیل اللہ کی تین منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں:

''جہاد فی سبیل اللہ کی اوّلین منزل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ شریعت کے اوامر و نواہی کا پابند ہونے کے لیے جہاد کیا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلے اپنے نفس امارہ کے خلاف جہاد ضروری ہے۔''(۳۴)

''جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل باطل عقائد و نظریات کے خلاف جہاد ہے۔''(۳۵)

''جہاد فی سبیل اللہ کی بلند ترین منزل نظام کی سطح پر جہاد یعنی نظام کو بدلنے کی جدوجہد ہے۔ یہ اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے باطل نظام اور طاغوت کے خلاف جہاد ہے۔''(۳۶)

''پہلی دو منزلوں کے جہاد کا جہاد فی سبیل اللہ ہونا اس شرط سے مشروط ہے کہ ہدف تیسری منزل ہو۔ اگر پیش نظر اقامت دین نہیں ہے تو پھر یہ چیزیں جہاد فی سبیل اللہ شمار نہیں ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ پہلی منزل پر تزکیۂ نفس خانقاہی نظام بن کر رہ جائے اور بس تزکیہ اور تربیت کا یہی عمل نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہے۔ اسی طرح اگر دعوت و تبلیغ کا ہدف بھی ''اقامت دین'' نہیں ہے تو پھر یہ بھی جہاد فی سبیل اللہ کے کھاتے میں شمار نہیں ہوگی۔ ع ''آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!''

لہٰذا آغاز ہی سے ہدف اقامت دین اور غلبۂ دین ہونا چاہیے۔ ابتدا ہی سے یہ ہدف سامنے رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ ساری جدّوجہد منزل بہ منزل اسی کے لیے ہو رہی ہے۔''(۳۷)

ڈاکٹر صاحبؒ کے نزدیک تیسری منزل پر آ کر جہاد فی سبیل اللہ اپنی بلند ترین صورت یعنی قتال فی سبیل اللہ یا مسلّح تصادم کی صورت اختیار کر لیتا ہے:

''اللہ کے دین کے غلبے کی جدّوجہد کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں بنایا گیا تو پھر یہ زندگی میرے نزدیک نفاق کی زندگی ہے۔ پھر اس باطل نظام کے تحت پھلنا' پھولنا' اپنی جائیدادیں بنانا اور کاروبار چمکانا جائز نہیں ہے۔ ایسی حالت میں بندۂ مؤمن اور کچھ نہ کرے لیکن under protest ضرور رہے' کیونکہ وہ مجبور ہے۔ وہ ان حالات میں ایک مجاہد کی حیثیت سے رہے اور مسلسل جہاد کرتا رہے۔ کم سے کم درجے میں اس نظام سے شدید نفرت تو ہو' اس کے ساتھ ہم آہنگی نہ ہو' اس نظام کی خدمت نہ کی جائے' اس

کی چاکری نہ کی جائے' اس کے ساتھ مصالحت (reconciliation) نہ ہو' بلکہ ایک جدوجہد ہو اور انسان یہ سمجھے کہ یہ میرے لیے فرضِ عین ہے۔ یہ جہاد بندۂ مؤمن پر فرضِ عین ہے۔ اس جہاد کے بغیر نجات نہیں ہے اور اس جہاد کے بغیر ایمان نہیں ہے۔ یہی وہ جہاد ہے جس کے بارے میں محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِیَ اللّٰهُ اِلٰی اَنْ یُّقَاتِلَ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الدَّجَّالَ))(۳۸)

''جہاد (فی سبیل اللہ) جاری ہے اس دن سے لے کر جس دن اللہ نے مجھے مبعوث کیا تھا اور اس وقت تک جاری رہے گا جب میری اُمت کا آخری حصہ دجال کے ساتھ جنگ کرے گا۔''

چنانچہ نوٹ کیجیے' بارہ برس مکہ میں جو جہاد ہوا وہ بھی جہاد فی سبیل اللہ تھا' قتال تو کہیں پندرہ برس بعد جا کر میدانِ بدر کے اندر ہوا ہے۔ پہلے جہاد حضور ﷺ نے تن تنہا کیا' پھر آپ ﷺ پر ایمان لانے والے آپ کے ساتھیوں نے یہی جہاد کیا۔ بارہ برس صبر محض (passive resistance) میں گزرے ہیں تو اس دوران بھی جہاد فی سبیل اللہ منزل بہ منزل آگے بڑھتا رہا ہے اور پھر اقدام (active resistance) کا ایک دو سال کا عرصہ ہے اور پھر جا کر مسلح تصادم (armed conflict) یعنی قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ آیا ہے۔''(۳۹)

(جاری ہے)

حوالہ جات وحواشی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب 'باب رحمة الناس والبهائم۔

(۲) سنن ابن ماجه ' المقدمة' باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين۔

(۳) ڈاکٹر اسرار احمد' تعارفِ قرآن مع عظمتِ قرآن' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' مئی ۲۰۰۹ء' ص ۹۵' ۹۶۔

(۴) صحیح مسلم' کتاب صلاة المسافرين و قصرها 'باب فضل من يقوم بالقرآن.....

(۵) صحیح مسلم' کتاب الطهارة 'باب فضل الوضوء۔

(۶) ڈاکٹر اسرار احمد' مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' اکتوبر ۲۰۱۱ء' ص ۶ تا ۷۔

(۷) سنن النسائی' کتاب صلاة العيدين' باب كيف الخطبة۔

(۸) ڈاکٹر اسرار احمد' مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق' ص ۵ تا ۶۔

(۹) ایضاً' ص ۷۔

(۱۰) ایضاً' ص ۵۲' ۵۳۔

(۱۱)ڈاکٹر اسرار احمد' فرائضِ دینی کا جامع تصور' تنظیم اسلامی' گڑھی شاہو' لاہور' فروری ۲۰۰۵ء' ص ۷' ۸۔
(۱۲)ایضاً' ص ۱۰۔ (۱۳)ایضاً' ص ۱۹' ۲۰۔
(۱۴)ایضاً' ص ۲۴' ۲۵۔ (۱۵)ایضاً' ص ۲۸' ۲۹۔
(۱۶) مسند احمد' مسند الشامیین' حدیث الحارث الاشعری عن النبی ﷺ۔
(۱۷) سنن النسائی' کتاب البیعۃ' باب ھجرۃ البادی۔ عن عبد اللّٰہ بن عمرو رضی اللّٰہ عنھما ۔
(۱۸)ڈاکٹر اسرار احمد' فرائض دینی کا جامع تصور' ص ۳۴' ۳۵۔
(۱۹)ایضاً' ص ۳۵۔ (۲۰)ایضاً' ص ۳۶۔
(۲۱)ڈاکٹر اسرار احمد' مسلمان خواتین کے دینی فرائض' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' جنوری ۲۰۱۱ء' ص ۳' ۴۔
(۲۲)ایضاً' ص ۱۰۔ (۲۳)ایضاً' ص ۱۰' ۱۱۔
(۲۴)ایضاً' ص ۱۵' ۱۶۔ (۲۵)ایضاً' ص ۱۶' ۱۷۔
(۲۶)ایضاً' ص ۱۷۔ (۲۷)ایضاً' ص ۲۰' ۲۱۔
(۲۸)ایضاً' ص ۲۳' ۲۴۔ (۲۹)ایضاً' ص ۲۹' ۳۰۔
(۳۰)شعب الایمان للبیھقی' التاسع و الثلاثون من شعب الایمان' باب فی حقوق الاولاد و الاھلین۔
(۳۱)ڈاکٹر اسرار احمد' جہاد فی سبیل اللہ' اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' مئی ۲۰۰۸' ص ۸' ۹۔
(۳۲)ایضاً' ص ۱۱۔ (۳۳)ایضاً' ص ۱۱' ۱۲۔
(۳۴)ایضاً' مئی ۲۰۰۸' ص ۲۷۔ (۳۵)ایضاً' ص ۳۳۔
(۳۶)ایضاً' ص ۵۰۔ (۳۷)ایضاً' ص ۶۷' ۶۸۔
(۳۸)سنن ابی داؤد' کتاب الجھاد' باب فی الغزو مع ائمۃ الجور۔
(۳۹)ڈاکٹر اسرار احمد' جہاد فی سبیل اللہ' اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج' ص ۶۸' ۶۹۔

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کا ایک جامع خطاب

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی امتیازی آراء (۲)

انجینئر نوید احمد

(۵) تحریکاتِ اسلامیہ کی ناکامی کے اسباب کی درست تشخیص

بیسویں صدی عیسوی میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے مختلف ممالک میں کئی احیائی تحریکیں سرگرم ہوئیں لیکن تا حال کوئی بھی تحریک کامیابی حاصل نہ کرسکی۔ غلبۂ دین کی جِدّوجُہد کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے' لہٰذا تجزیہ کرنا چاہیے کہ آخر وہ کیا سبب تھا جس کی وجہ سے کمی رہ گئی اور یہ تحریکیں ناکام ہوگئیں۔ ماضی کی کوتاہیوں سے سبق حاصل کرکے ہی آئندہ کے لیے درست منصوبہ بندی کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے تحریکوں کی ناکامی کے سبب کی تشخیص اس طرح کی:

> ''ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی معتد بہ تعداد کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا' جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور ترقی پسند عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آ گئی' لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہِ راست نتیجہ ہے ان کے تصورِ دین کی خامی اور مطالعہ اسلام کے نقص کا۔''(۴۰)

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں آگاہ فرمایا کہ مسلمان اُسی صورت میں غالب ہوں گے اگر وہ واقعی مؤمن ہوں:

﴿ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (آلِ عمران)

''اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مؤمن ہو۔''

قرآن کے اسی فرمان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحبؒ احیائی تحریکوں کے تصورِ دین کی خامی اور مطالعہ اسلام کے نقص کو یوں واضح کرتے ہیں:

> ''ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی

مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادے اور حیاتِ اُخروی پر حیاتِ دُنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان ماوراء الطبیعیاتی اعتقادات کا اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے' لیکن انہیں کچھ درخورِ اعتناء اور لائق التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلیتہً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز ہیں جو حیاتِ دُنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام نے دی ہیں اور جن کے مجموعے کا نام' اسلامی نظامِ زندگی' رکھا گیا ہے۔''(۴۱)

ڈاکٹر صاحبؒ نے احیائی تحریکوں کی اس خامی کو بیان کیا ہے کہ اُن کے یہاں اسلام کے ان ماوراء لطبیعیاتی اعتقادات کا اقرار تو موجود ہے جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے لیکن انہیں کچھ لائق التفات نہیں سمجھا گیا۔ اس نکتہ کی وضاحت ڈاکٹر صاحبؒ یوں کرتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار تو موجود ہے لیکن ایمان باللہ کی وہ کیفیت کہ آفاق وانفس میں تنہا وہی فاعل مطلق' مؤثر حقیقی اور مسبّب الاسباب نظر آنے لگے' بالکل مفقود ہے۔ آخرت کا اقرار تو کیا جاتا ہے لیکن اس پر ایسا ایمان کہ ''کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْعَابِرُ سَبِیْلٍ'' کی کیفیت پیدا ہو جائے' قطعاً ناپید ہے۔ رسالت کا اقرار تو ہے لیکن محبتِ رسولؐ نام کو موجود نہیں اور مقامِ رسالت کا تصور زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو ڈاک کے ہرکارے اور صرف اپنی زندگی میں ملت کے مرکز یعنی رہبر و مطاع سے زیادہ نہیں' اور جو سنت کے مقام سے زیادہ آگاہ ہیں انہوں نے بھی سنت عادت اور سنتِ رسالت کی تقسیم سے ایسا چور دروازہ پیدا کر لیا ہے جس سے کم از کم اپنی نجی زندگیوں کی حد تک زمانے کا ساتھ دینے کی آزادی برقرار رہے! گویا ایمان کا وہ اقرار پایا جاتا ہے جو قانونی اسلام کی بنیاد ہے اور یہ کیفیت کہ ایمان انسان کا 'حال' بن جائے نہ صرف یہ کہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کی کسی ضرورت و اہمیت کا احساس بھی سرے سے عنقا ہے!''(۴۲)

تجزیہ کے آخر میں ڈاکٹر صاحبؒ احیائی تحریکوں کے بارے میں تبصرہ کرتے ہیں:

''اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع مذہبی سے زیادہ 'سیاسی و عمرانی' اور دینی سے زیادہ 'دنیوی' ہیں۔ اور آخری تجزیے میں دوسری سیاسی و معاشی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ اُن کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریت یا اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور اِن کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے —— گویا درحقیقت مذہب کی اصل

اقدار کے احیاء کا کام تو ابھی شروع ہی نہیں ہوا۔

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر و بیشتر اس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتا رہا اور نہ یہ ہی یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا ؎

ہم تو فانی جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا''(۴۳)

ناکامیوں کا سبب بتانے کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے کامیابی کے حصول کے لیے لائحہ عمل ان الفاظ میں بیان کیا:

''اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور احیائے اسلام کا خواب ایمان کی عمومی تجدید کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ مسلمان ممالک کی سیاسی آزادی و خود اختیاری بھی یقیناً بہت اہم ہے اور اس سے بھی ایک حد تک اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوئی ہے' اسی طرح اسلامی نظام زندگی کا تصور اور اس پر ایک بہتر نظامِ حیات ہونے کے اعتبار سے اعتماد بھی ایک حد تک مفید اور قابل قدر ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ پیدا ہوا یا ہو رہا ہے ان کی سعی و جہد بھی احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لیکن اصل اور اہم تر کام ابھی باقی ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ عالم اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ اس امر کی جانب متوجہ ہوں اور جنہیں اس کی اہمیت کا احساس ہو جائے وہ اپنی تمام تر سعی و جہد کو اس پر مرکوز کر دیں کہ امت میں تجدید ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو اور ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کرے!''(۴۴)

(۶) اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے علمی و فکری کام کی وضاحت

ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کے نزدیک احیائی تحریکوں کی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ ایمانِ قلبی کے حصول اور اس میں اضافہ کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں دی گئی۔ لہٰذا اُن کی رائے میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے کرنے کا اہم ترین کام ہے ایمانِ قلبی کی بازیافت۔ اس حوالے سے ترجیح دینی ہوگی معاشرے کے اُن طبقات کو جو دانشور ہیں اور پورے معاشرے کو کسی راہ پر چلانے کی خداداد صلاحیت رکھتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر صاحبؒ:

''پھر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے لوگ ہر دور اور ہر معاشرے کی وہ ذہین اقلیت (intellectual minority) ہوتے ہیں جو از خود معاشرے کی رہنمائی کے منصب پر فائز اور اجتماعیت کی پوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبدیلی اور ان کے فکر و نظر کے انقلاب کو اولین اہمیت حاصل ہے—— اور اگر خدانخواستہ ایمان ان کے دلوں میں جاگزیں نہ ہوسکا اور انہیں جہالت و جاہلیت کی ظلمتوں سے نکالا نہ جاسکا تو صرف عوام الناس کے قلوب و اذہان کی تبدیلی سے کسی مؤثر اور پائیدار تبدیلی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔''(۴۵)

''بنابریں وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اٹھے جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات یعنی معاشرے کے ذہین ترین عناصر کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کردے—— اور انہیں مادیت و الحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی میں لے آئے اور خدا پرستی و خودشناسی کی دولت سے مالا مال کردے۔ خالص علمی سطح پر اسلامی اعتقادات کے مدلل اثبات اور الحاد و مادہ پرستی کے پُرزور ابطال کے بغیر اس مہم کا سر ہونا محال ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ چونکہ موجودہ دور میں فاصلے بے معنی ہوکر رہ گئے ہیں اور پوری نوعِ انسانی ایک کنبے کی حیثیت اختیار کرچکی ہے لہٰذا علمی سطح کا تعین کسی ایک ملک کے اعتبار سے نہیں بلکہ پوری دنیا کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق کرنا ہوگا—— اور اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ کام انتہائی کٹھن اور سخت محنت طلب ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس کے بغیر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔''(۴۶)

مذکورہ بالا علمی کام کرنے کے لیے کیا لائحۂ عمل اختیار کیا جائے؟ اِس سوال کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''پیش نظر علمی تحریک کے لیے سب سے پہلے ایسے ذہین اور باصلاحیت نوجوانوں کو تلاش کرنا ہوگا جن میں علم کی ایک شدید پیاس فطری طور پر موجود ہو، جن کے قلوب مضطرب اور روحیں بے چین ہوں، جن کو خود اپنے اندر یہ احساس موجود نظر آئے کہ اصل حقیقت حواس کی سرحدوں سے بہت پرے واقع ہے اور جن میں حقیقت کی تلاش و دریافت کا داعیہ اتنا شدید ہوجائے کہ وہ اس کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں اور آرام و آسائش کے حصول اور خوشنما مستقبل (careers) کی تعمیر سے یکسر بے نیاز ہوجائیں۔''(۴۷)

مطلوبہ علمی کام کے لیے نوجوانوں کو کیا کرنا ہوگا؟ اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب بیان

کرتے ہیں:

''ایسے نوجوانوں کو اولاً انسان کی آج تک کی سوچ بچار کا مکمل جائزہ لینا ہوگا' اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ انسانی فکر کی پوری تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس اعتبار سے منطق' ماوراء الطبیعیات' نفسیات' اخلاقیات اور روحانیات ان کے مطالعہ اور غور و فکر کا اصل میدان ہوں گے۔ (اگرچہ ضمنی طور پر عمرانیات اور طبیعیات کی ضروری معلومات کی تحصیل بھی ناگزیر ہوگی) فکر انسانی کے اس گہرے اور تحقیقی مطالعے کے ساتھ ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ وحی آسمانی اور اس کے آخری جامع اور مکمل ایڈیشن یعنی قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ حقیقت کی تلاش اور حقیقت نفس الامری کی دریافت کے نقطہ نگاہ سے کریں۔

پھر اگر ایسا ہو کہ قرآن کی روشنی ان پر واضح ہو جائے' اس کا پیغام انہیں اپنی فطرت کی آواز معلوم ہو' اس کے نور سے ان کے قلوب و اذہان منور ہو جائیں' آفاق و انفس کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں تمام بنیادی سوالوں کا تشفی بخش جواب انہیں مل جائے اور انبساطِ معرفت سے ان کے نفوس میں امن اور سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اسی کا نام ایمان ہے!

پھر یہی ہوں گے جنہیں ''رسوخ فی العلم'' حاصل ہوگا۔ جن کا علم ذہنی و اخلاقی آوارگی کے بجائے تقویٰ و خشیت الٰہی پر منتج ہوگا۔ جن کی شخصیتیں ''اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا'' کی مجسّم تفسیر اور ع ''قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن'' کی عملی تصویر ہوں گی۔''(۴۸)

پیش نظر علمی تحریک برپا کرنے کے لیے اب اِن نوجوانوں کو تین کام کرنے ہوں گے۔ سب سے پہلا ہے تخریبی کام یعنی فکر مغرب کا مدلّل و مؤثّر رد تاکہ ذہنوں سے اِس فکر کا رعب ختم کیا جاسکے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحبؒ لکھتے ہیں:

''مغرب کے فلسفہ و فکر کے مؤثر ابطال اور اس کی تہذیب و تمدّن کے واقعی استیصال کا کٹھن کام صرف ان لوگوں کے بس کا ہے جو ''علم حقیقت'' کے ان چشموں سے اچھی طرح سیراب ہوں جو قرآنِ حکیم کی آیاتِ بینات کی صورت میں رواں ہیں۔ ان ہی کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ آج کے فلاسفہ کے لیے ایک نئی ''تہافت''(۴۹) تصنیف کر سکیں اور آج کے منطقیین پر از سرِ نو ''رد''(۵۰) کر سکیں اور فی الجملہ الحاد و مادہ پرستی کے اس سیلاب کا رُخ پھیر دیں جو تقریباً دو صدیوں سے ذہنِ انسانی کو بہائے لیے چلا

جارہا ہے۔''(۵۱)

علمی تحریک کے حوالے سے دوسرا کام تعمیری نوعیت کا ہوگا اور وہ ہے جدید علم کلام کی تاسیس، یعنی اسلامی عقائد ونظریات کو دورِ حاضر کی اعلیٰ علمی سطح پر پیش کرنا۔ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں:

''اس تخریب کے ساتھ انہیں جدید علم الکلام کی تاسیس کا مثبت کام بھی کرنا ہوگا تا کہ ریاضی، طبیعیات، فلکیات، حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں جن حقائق کی دریافت آج تک ہوئی ہے اور جو اس حقیقتِ کلی کی ادنیٰ جزئیات ہیں جن کا مظہرِ اتم ایمان ہے، انہیں اسلامی عقائد کے نظام میں اپنے اپنے مقام پر فٹ کیا جا سکے۔ آج سے پینتیس چالیس سال قبل علامہ اقبال مرحوم نے ''الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید'' کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصہ تو اگرچہ بہت محلِ نظر ہے جو شریعت وقانون اور اجماع واجتہاد سے بحث کرتا ہے (اور جو فی الواقع ''الٰہیات'' سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علامہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکر انگیز تھی اور جیسا کہ خود علامہ نے کتاب کے دیباچے میں فرمایا تھا کہ..... ''ہوسکتا ہے کہ جیسے جیسے علم آگے بڑھے اور فکر کی نئی راہیں کھلیں، زیرِ نظر کتاب میں جو خیالات بیان ہوئے ہیں ان کے علاوہ بلکہ ان سے صحیح تر خیالات ظاہر ہوں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانی فکر کے ارتقاء کا ایک آزاد تنقیدی نقطۂ نگاہ سے مسلسل جائزہ لیتے رہیں.....''

اگر انہی خطوط پر کام جاری رہتا اور کچھ باہمت لوگ اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے تو ایک بہت وقیع اور قابل قدر کام ہو جاتا، لیکن افسوس کہ خود علامہ مرحوم کے حلقہ اثر میں سے بھی کسی نے اس میدان کو اپنی جولانی طبع کے لیے منتخب نہیں کیا۔

بہرحال جب تک اس میدان میں واقعی قدر و قیمت رکھنے والا کام ایک قابل ذکر حد تک نہیں ہو جاتا یہ امید کہ معاشرے کے ذہین طبقات کو مذہب کی طرف راغب کیا جا سکے گا محض سراب کا درجہ رکھتی ہے۔''(۵۲)

علمی تحریک کے ضمن میں تیسرا کام ہے عصر حاضر میں اسلام کے اجتماعی نظام کے مختلف گوشوں کو عملی صورت میں مرتّب و مدوّن کرنا اور دورِ حاضر کے اجتماعی مسائل کا حل پیش کرنا۔اس کا ذکر ڈاکٹر صاحبؒ نے یوں کیا:

''الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید'' کے بعد دوسرا اہم کام یہ ہے کہ حیاتِ دنیوی کے مختلف پہلوؤں یعنی سیاست وقانون اور معاشرت ومعیشت کے باب میں اسلام کی

ہدایت ورہنمائی کو مدلّل ومفصّل واضح کیا جائے۔اس ضمن میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ پچھلے پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں خاصا کام مصر اور برصغیر ہندو پاک ہند میں ہوا ہے' خصوصاً جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون نے ''اسلامی نظامِ حیات''(۵۳) اور ''**العدالة الاجتماعیه فی الاسلام**''(۵۴) کو تصنیف وتالیف کا مرکزی موضوع بنایا ہے۔تاہم اس سارے کام کو بس ایک اچھی ابتدا قرار دیا جا سکتا ہے.....اس کام کے لیے بھی ظاہر ہے کہ ایک طرف موجودہ دنیا کے مسائل ومعاملات کا صحیح فہم اور عمرانیات کے مختلف میدانوں میں جدید رجحانات کا براہِ راست علم ضروری ہے' اور دوسری طرف قرآن وسنت میں گہری ممارست لازمی ہے' اور جب تک یہ صورت نہ ہو کہ ان دونوں اطراف کا مطالعہ یکساں دقت نظر کے ساتھ کیا جائے' معیاری نتائج کی توقع عبث ہے۔''(۵۵)

مطلوب علمی کاموں کے لیے عملی اقدامات کا نقشہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اس طرح پیش کیا:

''مذکورہ بالا علمی تحریک کے اجراء کے لیے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں:

ایک یہ کہ عمومی دعوت وتبلیغ کا ایک ایسا ادارہ(۵۶) قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدیدِ ایمان اور اصلاح اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی وفکری اور اخلاقی وعملی تربیت کا بندوبست کرے اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوان تلاش کرے جو پیش نظر علمی کام کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں۔''(۵۷)

''دوسرے یہ کہ ایک قرآن اکیڈمی(۵۸) کا قیام عمل میں لایا جائے' جو ایک طرف علومِ قرآنی کی عمومی نشر واشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علوم جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم وحکمت سے بھی براہ راست آگاہ ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔''(۵۹)

(۷) غلبۂ دین کا دورِ حاضر میں طریقۂ کار

ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر اپنی مایہ ناز تصنیف ''منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ'' میں نبی اکرم ﷺ کے برپا کردہ ہمہ گیر انقلاب کے چھ مراحل بیان کیے:

(۱) قرآن کے ذریعہ ایک ایسے انقلابی نظریہ کی دعوت دینا جو رائج نظام کے اجتماعی گوشوں پر تیشہ بن

کرگرے۔

(۲) دعوت قبول کرنے والوں کو بیعتِ سمع وطاعت کی منصوص‘ مسنون اور ماثور اساس پر منظّم کرنا۔

(۳) منظّم ہونے والوں کی قرآن کے ذریعہ روحانی‘ اخلاقی اور فکری تربیت کرنا۔

(۴) صبرِ محض کا طرزِ عمل اختیار کرنا یعنی جب تک مناسب وسائل اور افرادی وقت فراہم نہ ہو ہر قسم کی مخالفت اور ظلم کے مقابلہ میں ڈٹے رہنا لیکن کوئی جوابی اقدام نہ کرنا۔

(۵) مناسب وسائل وافرادی قوت کی فراہمی پر رائج ظالمانہ نظام کے خلاف اقدام کرنا۔

(۶) اقدام کے ردّعمل میں رائج نظام کے ساتھ مسلح تصادم کا مرحلہ شروع ہو جائے گا جس میں پامردی سے ڈٹے رہنا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دورِ حاضر میں غلبۂ دین کے لیے سیرت النبی ﷺ سے ماخوذ مذکورہ بالا تمام مراحل پر عمل کیا جائے گا یا اُس میں کسی اجتہاد کی ضرورت ہوگی۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ اِس سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ’’دورِ حاضر میں حالات واقعات اس درجے تبدیل ہو گئے ہیں کہ انقلاب کے آخری مرحلے یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کے بارے میں اجتہاد کی واقعی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے دور میں ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف کفار تھے‘ اور حربی کافر کی گردن مارنے میں کسی کو کیا جھجک ہو سکتی تھی۔ جبکہ آج صورتِ حال یہ ہے کہ اِدھر بھی مسلمان ہیں اور اُدھر بھی مسلمان۔ ہمارے حکمران جیسے بھی ہوں‘ ہیں تو مسلمان۔ بھٹو‘ بے نظیر‘ ضیاء الحق‘ نواز شریف اور پرویز مشرف سب مسلمان ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُس زمانے میں طاقت کا فرق صرف تعداد کے اعتبار سے تھا۔ اِدھر ۳۱۳ رضا کار (volunteers) تھے تو اُدھر ایک ہزار رضا کار۔ اُدھر بھی باقاعدہ تربیت یافتہ مسلح فوج نہیں تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اُدھر ٹینک‘ توپیں‘ میزائل اور بم ہوں اور اِدھر مجاہدین صرف تلواریں لیے کھڑے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کی فوج کا رسالہ دو گھوڑوں پر مشتمل تھا‘ اُدھر سو گھوڑوں پر مشتمل رسالہ تھا۔ چنانچہ تعداد میں فرق ضرور تھا‘ نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا۔
>
> مزید برآں عمرانی ارتقاء (Social Evolution) کے نتیجے میں آج اس بات کا امکان موجود ہے کہ بغیر جنگ کے حکومت تبدیل کی جا سکتی ہے۔ آج یہ مانا جاتا ہے کہ ریاست اور ہے‘ حکومت اور ہے۔ شہری ریاست کے وفادار ہوتے ہیں‘ حکومت کے

نہیں۔حکومت کی تبدیلی تو عوام کا حق ہے۔اُس وقت تک ابھی عمرانی ارتقاء اس سطح تک نہیں پہنچا تھا' لہٰذا حکومت اور ریاست گڈمڈ تھے۔''(۶۰)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ تبدیل شدہ صورتِ حال میں غلبۂ دین کے لیے ممکن طریقہ ہائے کار کا ذکر کرتے ہیں:

''اب یہاں پر بغیر جنگ کے حکومت تبدیل کرنے کے دو راستے ہیں' ایک الیکشن کا راستہ اور ایک احتجاجی تحریک (agitation) کا راستہ۔الیکشن کے راستے سے نظام نہیں بدل سکتا' خواہ الیکشن کتنا ہی شفاف اور منصفانہ ہو۔اس سے تو صرف نظام کو چلانے والے ہاتھ بدل جاتے ہیں۔اس لیے کہ آپ کے معاشرے میں طاقت کے جو ستون موجود ہیں الیکشن میں انہی کا انعکاس ہوگا۔اگر ملک میں جاگیردارانہ نظام ہے تو کوئی جاگیردار ہی منتخب ہو کر آئے گا۔اگر سرمایہ دارانہ نظام ہے تو کوئی سرمایہ دار ہی آئے گا۔یہ تو شہروں میں کچھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے کہ کبھی کراچی میں جماعت اسلامی کی پوزیشن مستحکم ہوگئی تھی' کبھی ایم کیو ایم کی ہوگئی۔کیونکہ شہروں میں نہ جاگیردار ہیں نہ قبائلی سردار۔البتہ ہمارے دیہی علاقوں میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام قائم ہے۔سرمایہ دار اور جاگیردار الیکشن کے ذریعے منتخب ہو کر اقتدار میں آئیں گے تو کیا وہ جاگیرداری اور سرمایہ داری ختم کر دیں گے؟اس طرح تو وہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماریں گے۔تو جان لیجئے کہ الیکشن کسی نظام کو چلانے کے لیے ہوتا ہے' اسے بدلنے کے لیے نہیں ہوتا۔امریکہ میں دو پارٹیز ہیں' ری پبلیکنز اینڈ ڈیموکریٹس۔ان دونوں کے مابین امریکہ کے نظام کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔دونوں پارٹیوں کا دعویٰ صرف یہ ہے کہ ہم اس نظام کو اچھے انداز سے چلا سکتے ہیں۔ان کے منشور میں فرق ہوگا تو ٹیکسیشن پالیسی' ہیلتھ پالیسی یا امیگریشن پالیسی کا ہوگا۔برطانیہ میں کنزرویٹوز اور لیبر پارٹی کے نام سے دو پارٹیاں ہیں۔نظام کے بارے میں ان کے مابین بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ہاں' اگر امریکہ میں کمیونسٹ ہوں تو وہ نظام کے خلاف بولیں گے۔چنانچہ سی ایٹل اور واشنگٹن میں گلوبلائزیشن کے خلاف ہونے والے مظاہرے یہ پتا دیتے ہیں کہ وہاں کمیونسٹ عنصر موجود ہے۔لیکن ظاہر بات ہے وہ لوگ الیکشن کا راستہ کبھی بھی اختیار نہیں کریں گے' الیکشن کے ذریعے ان کی کامیابی کا سوال ہی نہیں۔''(۶۱)

الیکشن کے طریق کار کی نفی کے بعد ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے قابل عمل طریق کار یوں پیش کیا:

''دریں حالات ایک ہی راستہ باقی ہے۔وہ یہ کہ ایک پُرامن' منظّم عوامی تحریک اٹھے

جوتوڑ پھوڑ نہ کرے اور سرکاری یا غیر سرکاری املاک کو نقصان نہ پہنچائے' البتہ یہ لوگ خود جانیں دینے کو تیار ہوں۔ اس کو میں ''یک طرفہ جنگ'' سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ لوگ سڑکوں پر آ کر منکرات کے خلاف احتجاجی مظاہرے کریں۔ یہ لوگ حکومت پر اپنا موقف واضح کریں کہ ہم نے منکرات کے انسداد کے لیے آپ سے بہت درخواستیں کیں' آپ کے آگے ہاتھ جوڑے کہ خدارا سود ختم کر دو' لیکن اب ہم picketing کریں گے' دھرنا دیں گے' بینکوں کا گھیراؤ کریں گے اور اس سودی نظام کو جیتے جی نہیں چلنے دیں گے۔ چلاؤ ہم پر گولیاں!

میرے خیال میں اس وقت انقلاب کے لیے یہی قابل عمل طریقہ ہے۔ اگر ہم مشتعل ہو کر اسلحہ اٹھائیں تو کس کے خلاف اٹھائیں گے؟ بری افواج یا ایئر فورس کے خلاف؟ کیا ہماری ماضی کی حکومتوں نے بلوچستان میں دو مرتبہ ایئر فورس استعمال نہیں کی؟ کیا ایئر فورس کے ذریعے سے حافظ الاسد نے ایک دن میں ہزاروں اخوان ختم نہیں کر دیے تھے؟ اور ان کا مرکز بمباری کر کے تباہ و برباد نہیں کر دیا تھا؟ تو آج مقابلہ بہت غیر مساوی (unequal) ہے۔ جہاں ممکن ہو دو طرفہ جنگ بھی ہو سکتی ہے' کسی پہاڑی ملک میں کوئی چھاپہ مار جنگ بھی ہو سکتی ہے' یہ حرام نہیں ہے۔ دین کو قائم کرنے کے لیے حضور ﷺ نے جنگ لڑی ہے تو ہم بھی لڑ سکتے ہیں اور کلمہ گو کے خلاف بھی لڑ سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے موقف کے مطابق مسلمان حکمران اگر فاسق و فاجر ہوں تو ان کے خلاف بغاوت کی جا سکتی ہے۔ پہلے تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر زبان سے کیا جائے۔ اگر یہ زبان سے کہنا مؤثر ثابت نہ ہو تو پھر تلوار کے ذریعے سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیا جا سکتا ہے۔ تو جنگ اگرچہ جائز ہے' لیکن موجودہ حالات میں عملاً ممکن نہیں ہے۔ آج کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف یک طرفہ جنگ ہی موزوں لائحہ عمل ہے۔''(۶۲)

(۸) نور و بشر کے مسئلے کا معتدل حل

نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کے حوالے سے عقائد کی بحث میں ایک نزاعی مسئلہ نور و بشر کا ہے۔ یعنی آپ ﷺ بشر تھے یا نور؟ عوامی سطح پر مذہبی جلسوں میں اس مسئلے پر دھواں دار تقریریں ہوتی ہیں جن میں جوش و خروش اور غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک گروہ آپ ﷺ کی بشریت کی نفی اور نورانیت کے اثبات پر دلائل دیتا ہے اور دوسرا گروہ آپ ﷺ کی نورانیت کی نفی اور بشریت کے اثبات پر زور دیتا ہے۔ مناظرے اور مباحثے کا انداز فریقین میں باہم شدت اور تلخی بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اِس مسئلہ کا نہایت متوازن و معتدل حل پیش کیا:

''جان لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کے معاملے میں نہ یہ کہنا درست ہے کہ آپ ﷺ بشر نہیں تھے بلکہ نور تھے اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ آپ ﷺ نور نہیں تھے بلکہ بشر تھے۔ دونوں باتیں یکساں غلط ہیں' اصل حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ بیک وقت بشر بھی تھے اور نور بھی تھے۔ اور یہ معاملہ صرف رسول اللہ ﷺ کا نہیں ہے بلکہ میرا اور آپ کا اور ہر انسان کا ہے۔ ہر انسان کے اندر اُس کے وجود کے دو حصے ہیں۔ ایک اس کا ''حیوانی'' وجود ہے' وہ خاکیٔ الاصل ہے جو اِس زمین سے بنا ہے۔ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے ظلمانی ہے۔ اس میں تاریکی ہے' اس میں پستی کا رجحان ہے' اس میں برائی کا میلان ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''اور میں اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں' یقیناً نفس تو برائی پر اُبھارتا ہے''۔ لیکن انسان مجرد اِس پستی اور خاکیٔ الاصل وجود ہی کا نام نہیں ہے' بلکہ اس کے وجود کا دوسرا حصہ ''روح'' ہے۔

نقطۂ نوری کہ نامِ او خودی
زیر خاکِ ما شرارِ زندگی

انسانِ اوّل کو آدمؑ بنانے والی چیز یہی روحِ خداوندی تھی جو اُن میں پھونکی گئی۔ اور وہ روح خاکی اور ظلمانی نہیں ہے' بلکہ نورانی حقیقت رکھنے والی شے ہے۔ وہ ملائکہ کی ہم پلّہ ہی نہیں ملائکہ کی مسجود ہے۔ ملائکہ نوریٔ الاصل ہیں تو کیا روح خاکیٔ الاصل ہے؟ نہیں' روح خاکی اور ظلمانی نہیں ہے' بلکہ نورانی ہے۔ بقولِ اقبال :ؔ

ہے ذوقِ تجلّی بھی اِسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

حواسِ خمسہ یعنی دیکھنا' سننا' سونگھنا' چکھنا اور چھونا تو حیوانات میں بھی ہیں! انسان نے بھی اپنی حقیقت اگر یہی سمجھی تو اُس نے گویا اپنی اصل عظمت کو نہیں پہچانا۔ ادراک تو اصل میں اپنے سے باہر کی کسی شے کو محسوس کرنا ہے' جبکہ روشنی تو خود اپنا ظہور چاہتی ہے' اپنی تجلّی چاہتی ہے۔ تو انسان کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے وجود کے دو حصے ہیں' ایک اس کا یہ حیوانی وجود ہے' جو خاکیٔ الاصل ہے' ظلمانیٔ الاصل ہے۔ اس کا میلان پستی اور گناہ کی طرف ہے۔ اور ایک اس کا روحانی وجود ہے جو نورانی الاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تھا: ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ﴾ (الحجر) ''پس جب میں اسے (آدمؑ کو) بنا سنوار لوں اور اس میں

اپنی روح میں سے پھونکوں تو گر پڑنا اس کے سامنے سجدے میں''۔ یہاں روح کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے۔

تو یہ ہے ہمارا وہ نورانی عنصر جو ہر ایک انسان میں ہے۔ لیکن ع ''در حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی'' کے مصداق سب کا نور برابر تو نہیں ہے۔ کسی کا محض ایک ٹمٹماتا ہوا دیا ہے۔ کسی کی اس نورانیت پر اس کے نفس کی ظلمانیت اس طرح چھا گئی ہے کہ وہ نور معدوم کے درجے میں ہے۔ یعنی اس کی فطرت کا نور بجھ چکا ہے' جبکہ کسی کا وہ نور اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اس کی تمثیل یوں بیان کی ہے: ﴿یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ط﴾ (النور:۳۵) ''(کسی کی فطرت کا نور اتنا صاف اور شفاف ہے کہ) بھڑک اٹھنے کو بے تاب ہے' چاہے اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ روشنی پر روشنی ہے''۔ یہ ہے وہ نور جو حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی شخصیت میں موجود تھا۔ ابھی وحی کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا' لیکن ان کے اندر اخلاقِ حسنہ کے انوار پہلے سے موجود تھے۔ ایسے ہی تمام صدیقین اور انبیاءؑ کے اندر نورِ فطرت موجود ہوتا ہے۔ اب اس تناظر میں دیکھئے تو نبی اکرم ﷺ کی شخصیت مبارکہ چونکہ بلند ترین ہے تو آپ ﷺ کی نورانیت بھی اتنی کامل ہے کہ اس نے خاکی وجود کی ظلمانیت کو بالکل معدوم کر دیا ہے۔ اس معنی میں اگر کہا جائے کہ نبی اکرم ﷺ نورِ مجسم ہیں تو غلط نہیں ہے۔

تو یہ دونوں چیزیں بیک وقت صحیح ہیں۔ نبی اکرم ﷺ بیک وقت بشر بھی ہیں اور نور بھی ہیں۔ آپ ﷺ کی بشریت کا کون انکار کرے گا! آپ ﷺ کی ولادت ہوئی ہے جیسے کسی انسان کی ولادت ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کے بھی وہی دو ہاتھ اور دو پاؤں تھے۔ وہی انسانی خون آپ ﷺ کے وجود میں بھی سرایت کیے ہوئے تھا اور گردش کر رہا تھا۔ طائف میں آپ ﷺ پر پتھراؤ ہوا ہے تو زخموں میں سے خون رسا ہے۔ میدانِ اُحد میں جب تلوار کا وار آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر لگا ہے تو خون کا فوارہ چھوٹا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے شادی کی ہے اور آپ ﷺ کے ہاں اولاد ہوئی ہے۔ لیکن اِس سب کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی نورانیت کی نفی ہرگز نہ کیجیے! آپ ﷺ کی نورانیت کی نفی درحقیقت اِس دَور کا مادّہ پرستانہ فکر ہے جو میری آج کی بحث کا اصل موضوع ہے۔ ہم نے مادہ پرستانہ فکر اپنے ذہنوں پر اتنا مسلّط کر لیا ہے کہ ہم روح کی حقیقت اور اس کے جداگانہ تشخّص سے یا تو بالکلّیہ منکر ہو گئے ہیں یا اس کا زبان پر ذکر لاتے ہوئے ہمیں حجاب محسوس ہوتا ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں!

کہ روحانیت کی باتیں کرتے ہو؟ روح کی بات کرتے ہو؟ روح کو کوئی علیحدہ وجود مانتے ہو؟ تو یہ چیزیں ہمارے فکر اور نظریات کے دائرے سے اس طور سے باہر چلی گئی ہیں کہ اب ہم سمجھتے ہیں کہ انسان تو بس اسی حیوانی وجود کا نام ہے۔ ہم اپنے اس وجودِ حیوانی ہی کو اصل انسان سمجھے بیٹھے ہیں' اس لیے نورانیت کی نفی ہو رہی ہے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمارا جو نورانی عنصر ہے' ایمان اور عمل صالح سے اس کی نورانیت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے برعکس گناہوں اور نفسانیت سے یہ نور بجھتا چلا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ الحدید اور سورۃ التحریم میں دو جگہ میدانِ حشر کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اُس دن اہل ایمان کی شان یہ ہوگی کہ:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾﴾ (الحدید)

''اُس دن آپ مؤمن مردوں اور عورتوں کو دیکھیں گے کہ اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور اُن کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔ (اُن سے کہا جائے گا) آج بشارت ہے تمہارے لیے ایسے باغات کی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔''

آگے منافقین کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ﴾ (الحدید: ۱۳)

''اُس دن منافق مردوں اور عورتوں کا حال (جو دنیا میں چراغ گل کر کے جائیں گے) یہ ہوگا کہ وہ اہل ایمان سے استدعا کریں گے: ذرا ہماری طرف دیکھو (ذرا ہمیں مہلت دو)' تاکہ ہم تمہارے نور سے استفادہ کریں۔ کہا جائے گا لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف (اگر ہو سکتا ہے تو دنیا میں واپس جاؤ) اور اس نور کی تحصیل کر کے آؤ۔''

سورۃ التحریم' آیت ۸ میں ہے:

﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا

وَاغْفِرْ لَنَا ۖ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۸﴾

''اُن کا نور اُن کے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے ربّ! ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما' یقیناً تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اس نور کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ قیامت کے دن کسی کا نور بس اتنا ہوگا کہ اس سے صرف اس کے قدموں کے آگے روشنی ہو جائے گی' اور کسی کا نور اِس قدر ہوگا کہ اس کی روشنی مدینہ منورہ سے صنعاء تک پہنچے گی (۶۳)۔ یعنی اُس روز کسی کا نور بہت تھوڑا ہوگا کہ بس اس سے قدموں کے آگے آگے روشنی ہوگی۔ اور قیامت کے دن یہ نور بھی بہت غنیمت ہوگا جس کو نصیب ہو گیا۔ اس لیے کہ اندھیرے میں ایک ٹارچ بھی بہت غنیمت ہوتی ہے جس سے آپ بالآخر منزلِ مراد تک پہنچ سکتے ہیں۔ جبکہ کسی کا نور اُس روز بہت زیادہ ہوگا جس سے ہر سو چراغاں ہو جائے گا۔ یہ حفظِ مراتب ہے۔ اس تناظر میں دیکھئے تو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا نور کس قدر ہوگا! تو اِن باتوں کو ذہن میں رکھیے تو جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بیک وقت ''بشر'' بھی ہیں اور ''نور'' بھی ہیں۔''(۶۴)

(۹) فلسفۂ وحدت الوجود کی حکیمانہ تعبیر

ابن عربیؒ' مولانا رومؒ' شیخ احمد سرہندیؒ' شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور دیگر نامور صوفیاء وحدت الوجود کے نظریہ کو درست مانتے ہیں۔ سطحی سا علم رکھنے والے بعض عناصر ''وحدت الوجود'' اور ''ہمہ اوست'' (Pantheism) کے درمیان فرق کو نہ سمجھ سکے۔ وہ ان دونوں تصورات کو ایک ہی سمجھ کر مذکورہ بالا شخصیات کے بارے میں سوءِ ظن میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ لوگ تو انہیں مشرک کہہ دیتے ہیں اور باقی لوگوں کی رائے بھی یہ ہے کہ وہ گمراہی کی طرف چلے گئے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ نے وحدت الوجود اور ہمہ اوست کے فرق کو بڑی عمدگی سے واضح کر کے اسلاف کے بارے میں سوئے ظن کا ازلہ کر دیا۔ فلسفۂ وحدت الوجود کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اب ذرا نظریہ ''وحدت الوجود'' کی بحث کی طرف آیئے کہ صرف اللہ کا وجود مطلق ہے' قدیم ہے اور دائم ہے' جبکہ ماسوٰی کا وجود عطائی ہے' محدود ہے' حادث اور فانی ہے۔ گویا وجود تو صرف اسی کا ہے' کسی اور کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ یہ ماسوٰی سے وجود کی نفی ہے۔ یہ ''وحدت الوجود'' ہے اور درحقیقت یہ توحید فی الصفات کی بلند ترین منزل ہے۔

جو یہاں نہیں پہنچا وہ فکری سطح کے اعتبار سے توحید کی آخری منزل تک نہیں پہنچا۔''(۶۵)

پھر ڈاکٹر صاحبؒ ''وحدت الوجود'' اور ''ہمہ اوست'' کے فرق کو یوں واضح کرتے ہیں:

''نظریہ ''ہمہ اوست'' کو تو میں بھی کفر اور شرک سمجھتا ہوں۔ لیکن ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے فرق کو جان لیجیے! ''ہمہ اوست'' کو یوں سمجھئے کہ برف پگھل کر پانی بن گیا تو برف معدوم ہوگئی اور اب پانی ہی برف ہے۔ لہٰذا اِس اعتبار سے تو یہ کائنات حقیقت قرار پاتی ہے اور 'نعوذ باللہ' خدا اس میں گم ہو جاتا ہے۔ جبکہ وحدت الوجود یہ ہے کہ حقیقت وجود صرف خدا کے لیے ہے اور ماسوٰی کا وجود ہی نہیں ہے۔ تو ان دونوں نظریات میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہوگیا اور یہ ایک دوسرے کی ضد ہو گئے۔ اس لیے کہ ''ہمہ اوست'' میں مخلوق حقیقت ہے اور خالق اس میں گم ہے اور ''وحدت الوجود'' میں خالق حقیقت ہے اور مخلوق کا وجود گم ہے۔ لہٰذا جب ان دونوں نظریات کو خلط مبحث کیا گیا تو بہت سے لوگوں کو مغالطہ ہوگیا۔ جب یہ confusion زیادہ ہوا تو اس میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے اصلاح کی اور انہوں نے ''وحدت الوجود'' کے بجائے ''وحدت الشہود'' کا نظریہ پیش کیا۔''(۶۶)

وحدت الشہود کے نظریہ کی وضاحت ڈاکٹر صاحبؒ نے اِن الفاظ میں کی:

''وحدت الشہود یہ ہے کہ حقیقی وجود صرف اللہ کا ہے اور کائنات کا وجود اعتباری ہے اور اُس کا محض عکس ہے۔ جیسے اصل وجود درخت کا ہوتا ہے' لیکن اس کا سایہ جو زمین پر پڑ رہا ہوتا ہے وہ نظر تو آ رہا ہوتا ہے لیکن اس کا وجود کوئی نہیں ہوتا۔ ایسے ہی یہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے اظلال اور سائے ہیں اور ان کی کوئی ذاتی حقیقت نہیں ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا: ؎

كلُّ ما فی الكون وهمٌ او خيال
او عكوسٌ فی المرايا او ظلال

کہ جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ محض وہم ہے یا خیال ہے' یا جیسے شیشے میں کوئی عکس ہوتا ہے یا سایہ۔ آپ شیشے میں نظر تو آ رہے ہوتے ہیں لیکن وہاں ہوتے نہیں ہیں۔ اسے ایک مثال سے یوں واضح کیا گیا کہ ایک لکڑی لے کر اس کے ایک سرے پر کپڑا باندھیں اور اس کے اوپر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دیں اور اسے ایک دائرے میں تیزی کے ساتھ حرکت دیں تو دیکھنے والوں کو یہ ایک آتشیں دائرہ نظر آتا ہے' لیکن درحقیقت وہ آگ کا دائرہ نہیں ہوتا' بلکہ شعلے کی حرکت آتشیں دائرے کا روپ دھار

لیتی ہے۔ اب دیکھئے اس نظریے میں کائنات اور ماسویٰ کی نفی ہوگئی اور اثبات صرف اللہ کا ہوا۔ ''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود'' میں صرف تعبیر کا فرق ہے' اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ فرق کیا ہے۔ یہ محض سمجھانے کا ایک لطیف سا انداز ہے۔''(۶۷)

بحث کے آخر میں وجودِ باری تعالیٰ کی ہمہ گیریت اور یکتائیت کو سمجھانے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے ایک خوبصورت تمثیل کا سہارا لیا ہے:

''اس کی ایک اور بہترین تمثیل اِس دَور میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے یہ بیان کی کہ تم ذرا تصور کر کے اپنے ذہن میں تاج محل یا مینارِ پاکستان کا نقشہ لے آؤ۔ یہ گویا تمہاری محض ایک خیالی تخلیق ہے جو تمہارے ذہن میں ہے اور تمہارے ذہن سے باہر اِس کا کوئی وجود نہیں۔ اس کے اوپر بھی تم ہو' اس کے نیچے بھی تم ہو' اس کے باہر بھی تم ہو اور اس کے اندر بھی تم ہو۔ تو یہی نسبت خالق و مخلوق کے مابین ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ (الحدید:۳) ''وہی اوّل ہے' وہی آخر ہے' وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے''۔ اور یہ کائنات محض اس کے خیال کے مانند ہے۔ ہمارا خیال تو بڑا کمزور سا خیال ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا خیال بڑا ٹھوس اور پختہ خیال ہے۔ البتہ یہ جان لیجیے کہ جس طرح ہماری ذہنی تصویر کا انحصار اور قیام ہماری توجہ پر ہوتا ہے' جیسے ہی توجہ ہٹتی ہے تصویر بھی ذہن سے محو ہو جاتی ہے' اسی طرح اس کائنات کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کی توجہ سے ہے۔ اُس کی توجہ ہٹے تو یہ معدوم ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ وہ الحیّ القیّوم ہے' از خود ہے اور اس کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ جیسے تم اپنی توجہ کو مرتکز رکھو گے تو وہ ہیولیٰ تمہارے ذہن میں رہے گا' تم قیوم ہو اُس کے' ایسے ہی اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا القیوم ہے' اسے تھامے ہوئے ہے۔''(۶۸)

(۱۰) شادی بیاہ کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے معاشرہ میں شادی بیاہ' ولادت اور وفات کے مواقع پر جو رسوم ادا کی جاتی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر ہندوانہ تہذیب کی الباقیات السیئات ہیں اور ان کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ خاص طور پر شادی کے موقع پر لوازمات و رسومات کے روز افزوں طومار نے جس طرح ایک سماجی برائی کی شکل اختیار کر لی ہے اس کا شدید احساس ہر صاحبِ نظر اور ملک و ملت کا درد رکھنے والے انسان کو ہے۔ امیروں کے لیے تو یہ

تقریبات ورسومات صرف ''چونچلوں'' یا پھر اپنے ''کالے دھن'' کے نمائش واظہار کے ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں' لیکن عوام کی اکثریت کے لیے یہ ناقابل برداشت بوجھ یا بالفاظ دیگر پاؤں کی بیڑیاں اور گلے کا طوق بن گئی ہیں' جن کے باعث شادی میں تاخیر ہوتی ہے اور اس ''اُمّ الخبائث'' (شادی کی تاخیر) کے بطن سے اخلاقی اور نفسیاتی امراض کا ایک لامتناہی سلسلہ جنم پاتا چلا جاتا ہے۔ ہمارا دین' دین فطرت ہے۔ اس نے فطرت کے مطابق ان تمام مواقع اور تقاریب کے لیے ایسی مبنی برعدل رہنمائی عطا فرمائی ہے جس سے معاشی اعتبار سے کسی بھی معیار کے خاندان کے لیے ناقابل برداشت بوجھ کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

ملت کے چند دیگر مصلحین کی طرح ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی تقاریر کے ذریعہ شادی کے موقع پر بے جا رسومات کی اصلاح کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''میں نے ''خطبۂ نکاح'' سے قبل ''خطاب'' کا سلسلہ شروع کیا جس میں ان آیات و احادیث کی مختصر تشریح بھی ہوتی تھی جو نکاح کے مسنون خطبے میں شامل ہیں اور کچھ عمومی دعوت ونصیحت بھی ہوتی تھی اور خاص طور پر حدیث مبارکہ ((اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ)) کے ضمن میں جہاں رہبانیت کی نفی ہوتی تھی' وہاں سنت کا وسیع تر تصور بھی سامنے رکھا جاتا تھا اور آخر میں نہایت زور دے کر کہا جاتا تھا کہ ''اتباعِ سنت'' کے پہلے قدم کے طور پر کم از کم شادی بیاہ کی تقریبات اور رسومات کے ضمن میں تو ہمیں یہ طے کر ہی لینا چاہیے کہ ان میں سے صرف وہی چیزیں باقی رکھی جائیں جن کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مل جائے اور باقی تمام بعد کی ایجاد کردہ یا باہر سے درآمد شدہ رسومات کو پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ پاؤں تلے روند دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ نکاح مسجد میں ہونا چاہیے (۶۹)' جہیز اور بری وغیرہ کی نمائش بالکل نہیں ہونی چاہیے' گھروں کی تزئین وآرائش اور بالخصوص روشنی وغیرہ پر اسراف سے بچنا چاہیے اور دعوتِ طعام صرف ایک ہونی چاہیے' یعنی دعوتِ ولیمہ۔ لڑکی والوں کی جانب سے نکاح کے موقع پر دعوت طعام کا سلسلہ بالکل بند ہونا چاہیے' وغیرہ وغیرہ۔'' (۷۰)

مسلسل پانچ چھ برس تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا کہ لوگ ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن کر نگاہیں نیچی کر لیتے تھے' فوری تأثر کے آثار بھی ان کے چہروں پر ظاہر ہوتے تھے۔ بعد میں بہت سے لوگ اس وعظ کی تائید وتحسین بھی فرماتے تھے' لیکن جب موقع آتا تھا تو کرتے وہی

کچھ تھے جو معاشرے میں رائج تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۳ء کے اواخر میں ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابصار احمد انگلینڈ سے پی ایچ ڈی کی تکمیل کر کے واپس آئے اور ان کی شادی کا مرحلہ آیا۔ وہ تمام بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور گویا خاندان کی ایک نسل کی سطح پر یہ آخری شادی تھی۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کن اقدام کا عزم کیا۔ لکھتے ہیں:

''..... کراچی میں بعض تجارت پیشہ برادریوں میں نکاح کی مجالس کے مساجد میں انعقاد کا معمول کافی عرصہ سے جاری ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ کراچی سے جس برائی کا آغاز ہوا سے لاہور یا پنجاب کے دور دراز گوشوں تک پہنچنے میں کوئی دیر نہیں لگتی، لیکن ایک بھلا کام جو وہاں عرصے سے ہو رہا ہے اس کے بارے میں یہاں تا حال سوچا بھی نہیں گیا۔ چنانچہ میں نے اپنے بھائی کا نکاح مسجد میں منعقد کر کے اور تمام غیر اسلامی رسوم سے اجتناب کر کے اصلاحی کام کا آغاز کر دیا ہے۔ نیز میں نے اس کے ساتھ ہی ''میثاق''(۱۷) میں اپنے ان فیصلوں کا بھی اعلان کر دیا کہ میں آئندہ سے:

ا) کسی بارات میں شرکت نہیں کروں گا، کیونکہ میرے محدود مطالعہ کی حد تک بارات کا رائج الوقت طریقہ خالص ہندوانہ تصورات پر مبنی ہے۔

ب) نکاح کے موقع پر کسی دعوتِ طعام میں شامل نہیں ہوں گا، کیونکہ خیر القرون سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ شادی کے ضمن میں لڑکے والوں کی طرف سے دعوتِ ولیمہ مسنون ہے، جس کا نہ صرف ثبوت بلکہ نبی اکرم ﷺ کا تاکیدی حکم بھی ملتا ہے۔

ج) نکاح کی کسی ایسی تقریب میں شرکت نہیں کروں گا جو مسجد میں منعقد نہ ہو۔

الحمد للّٰہ والمنۃ! میں اپنے ان فیصلوں پر کاربند ہوں۔ میں آپ حضرات کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ صرف نکاح کے مسجد میں انعقاد پر اکتفا نہ کیجیے، بلکہ معاشرے سے شادی بیاہ کی ان تمام رسومات کو ختم کرنے کی کوشش کیجیے جن کا اسلام سے سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جن کا طومار اور بوجھ ہم نے خود اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ شادی بیاہ کی ان تمام رسوم کا، جن کا ہمارے ہاں رواج ہے، جب بھی منصفانہ جائزہ لیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ ان کی اصل ہندوانہ رسم و رواج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو قرآن حکیم اور اُسوۂ رسول ﷺ کے ذریعے ہمارے کاندھوں پر سے بوجھ اتارے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ ''اور (ہمارا یہ نبی اُمیؐ) لوگوں پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور

وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے!'' پس نبی اکرم ﷺ کا احسانِ عظیم یہ ہے کہ آپ ﷺ نے دین کو آسان سے آسان بنایا ہے۔ آپ ﷺ نے ہدایت دی کہ ((یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا)) (متفق علیہ) ''آسانیاں پیدا کرو' مشکلات پیدا نہ کرو''۔ لیکن ہم ہیں کہ مشکل پسند بن گئے ہیں۔ ہم نے شادی بیاہ کی تقریب میں لاتعداد اضافی رسوم کو اختیار کر رکھا ہے' جس سے شادی ایک بے انتہا گراں مسئلہ بن گیا ہے۔''(۷۲)

جہیز کا مطالبہ کرنے والوں کو شرم دلاتے ہوئے ڈاکٹر صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''میں کہا کرتا ہوں کہ بیٹی والوں کا ایثار دیکھو کہ وہ اپنے لختِ جگر کو دوسروں کے حوالے کر رہے ہیں' لیکن پھر بھی بیٹے والوں کا دل نہیں بھرتا اور رسومات کے نام پر اُن کے مطالبات کی فہرست کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ جہیز ویسے ہی ہندوانہ رسم ہے' لیکن پہلے یہ ہمارے ہاں عام گھریلو استعمال کی اشیاء تک محدود رہتا تھا' لیکن اب تو بیٹے والوں کو فریج بھی چاہیے' ٹیلی ویژن بھی اور کار بھی! میں نے سنا ہے کہ مکان اور فلیٹ کا بھی مطالبہ ہوتا ہے۔ خدارا غور کیجیے کہ جس بچی کے باپ کے پاس یہ سب مطالبات پورے کرنے کے وسائل و ذرائع نہ ہوں اور پھر اس کی ایک نہیں اور بھی بچیاں ہوں تو وہ کیا کرے' کہاں جائے' اپنی سفید پوشی کا بھرم کیسے قائم رکھے اور اپنی جوان بیٹیوں کو کیسے بیاہے!!''(۷۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے جن اقدامات کا فیصلہ کیا وہ شدت کا رنگ لیے ہوئے ہیں لیکن جب تک ایسی سختی نہ کی جائے لوگ اپنی گردنوں سے رسومات کے بوجھ اتارنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر صاحبؒ بیان فرماتے ہیں:

''مجھے اعتراف ہے کہ اس معاملے میں کسی قدر شدت کی صورت پیدا ہوئی' لیکن میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ اس کے بغیر معاملہ کسی طرح ٹس سے مس نہ ہوتا۔ الحمدللہ کہ میرے رفقاء و احباب میں بہت سے لوگوں نے اس معاملے میں میرا پورا ساتھ دیا جس کے نتیجے میں اس اصلاحی کوشش نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔''(۷۴)

۲۷/اگست ۱۹۸۱ء کو بعد نمازِ مغرب ڈاکٹر صاحبؒ کی تیسری بچی کا عقدِ نکاح' مسجد جامع القرآن لاہور میں ڈاکٹر صاحب کے طے کردہ اصولوں کے تحت منعقد ہوا۔ اس پر انگریزی روزنامے ''پاکستان ٹائمز'' نے بھی ''An Austere Marriage'' کا چوکھٹا نمایاں طور پر لگایا اور جناب م ش نے تو اپنی ڈائری (نوائے وقت ۳۰ اگست ۱۹۸۱ء کے کالم) میں تحریر کیا:

ایک ٹن وعظ کے مقابلے میں ایک اونس عمل زیادہ وزنی ہوتا ہے!!

''ایک ٹن وعظ کے مقابلے پر ایک اونس عمل زیادہ وزنی ہوتا ہے''۔اس اصول کا عملی مظاہرہ گزشتہ جمعرات کو قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور میں اس وقت ہوا جب مشہور عالمِ دین اور مفسّرِ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی بیٹی کی شادی کی جملہ تقریبات عین سنّتِ نبویؐ کے مطابق انجام دے کر ایک عملی مثال قائم کی۔ میں نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ہزاروں کی تعداد میں مواعظِ حسنہ میں شرکت کی ہے لیکن اس موقع پر میری روح نے ان کی تقریر دل پذیر کے جو اثرات قبول کیے وہ انمٹ تھے۔

نمازِ مغرب کے وقت مسجد کا ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ امامت کے فرائض ڈاکٹر اسرار احمد نے انجام دیے۔ قرآن پاک کی آیاتِ مبارکہ تلاوت کرنے میں ان کے لحن میں سوز داؤدی ابھر آیا تھا۔ نماز سے فارغ ہوئے تو ایک مختصر تقریر میں جہیز اور ولیمہ کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ پھر خطبۂ نکاح پڑھا اور بس ان کی بیٹی سلمہا بیاہی گئیں۔ اور یہ تقریب درود وصلوٰۃ کے درمیان اختتام پذیر ہوئی۔

ہمارے ہاں شادی بیاہ' موت اور ختنہ وغیرہ کی تقریبات ایک ہنگامہ' ایک مسلسل دردِ سر اور اسرافِ بیجا کا نشان بن چکی ہیں۔ ہزاروں مساجد' ریڈیو اور ٹیلی یژن سے کم وبیش روزانہ امام صاحبان اور مقررحضرات اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ان تقریبات سے متعلق بدعتوں کے خلاف دھواں دھار تقاریر کرتے ہیں لیکن عمل کے لحاظ سے کوئی شخص ٹس سے مس نہیں ہوتا' ہنگاموں کا دردِسر اور اسرافِ بیجا کا عمل غیر مختتم طور پر جاری رہتا ہے۔ لیکن پاکستان میں کم از کم ایک بندۂ خدا نے قول وفعل کے تضاد سے بچتے ہوئے ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ میں دعا کرتا ہوں کہ اس پر گامزن ہونے کی ہر پاکستانی کو توفیق ارزاں ہو۔ آمین!''

☆ حوالہ جات وحواشی:

(۴۰) ڈاکٹر اسرار احمد' اسلام کی نشاۃِ ثانیہ.....کرنے کا اصل کام' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' فروری ۲۰۱۱ء' ص ۱۳۔

(۴۱) ایضاً' ص ۱۴۔ (۴۲) ایضاً' ص ۱۴۔

(۴۳) ایضاً' ص ۱۶' ۱۷۔ (۴۴) ایضاً' ص ۱۷۔

(۴۵) ایضاً' ص ۲۰۔ (۴۶) ایضاً' ص ۲۱۔

(۴۷) ایضاً' ص ۲۱۔ (۴۸) ایضاً' ص ۲۱' ۲۲۔

(۴۹)امام غزالیؒ کی کتاب ''تہافت الفلاسفہ'' کی طرف اشارہ ہے۔
(۵۰)امام ابنِ تیمیہؒ کی کتاب ''الردّ علی المنطقیین'' کی طرف اشارہ ہے۔
(۵۱)ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ.....کرنے کا اصل کام، ص ۲۳۔
(۵۲)ایضاً، ص ۲۳، ۲۴۔
(۵۳)مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تصنیف ''اسلامی نظامِ حیات'' کی طرف اشارہ ہے۔
(۵۴)سید قطب شہیدؒ کی تصنیف ''العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام'' کی طرف اشارہ ہے۔
(۵۵)ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ.....کرنے کا اصل کام، ص ۲۴، ۲۵۔
(۵۶)ڈاکٹر صاحب نے اس مقصد کے لیے ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم کی۔
(۵۷)ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ.....کرنے کا اصل کام، ص ۲۵۔
(۵۸)ڈاکٹر صاحب نے اس مقصد کے لیے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم کی جس کی شاخیں پاکستان کے کئی شہروں میں قائم ہوئیں۔ان انجمنوں کے تحت کئی شہروں میں قرآن اکیڈمیز قائم ہیں جو مطلوب علمی کام کے لیے سرگرم ہیں۔
(۵۹)ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ.....کرنے کا اصل کام، ص ۲۶۔
(۶۰)ڈاکٹر اسرار احمدؒ رسولِ انقلابؐ کا طریق انقلاب، تنظیم اسلامی گڑھی شاہو لاہور، جون ۲۰۱۱ء، ص ۵۰۔
(۶۱)ایضاً، ص ۵۱، ۵۲۔ (۶۲)ایضاً، ص ۵۲، ۵۳۔
(۶۳)ابی جعفر محمد بن جریر طبری، تفسیرالطبری جامع البیان عن تاویل آی القرآن، سورۃ الحدید آیت ۱۲، مرکز البحوث والدرسات العربیۃ والاسلامیہ، قاھرہ، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱م، جلد ۲۲، ص ۳۹۷۔
(۶۴) ڈاکٹر اسرار احمد، حقیقت و اقسامِ شرک، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۴۳ تا ۴۷۔
(۶۵)ایضاً، ص ۷۹، ۸۰۔ (۶۶)ایضاً، ص ۸۰۔
(۶۷)ایضاً، ص ۸۰، ۸۱۔ (۶۸)ایضاً، ص ۸۱، ۸۲۔
(۶۹)ارشادِ نبوی ﷺ ہے: ((اَعْلِنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ)) ''نکاح کا اعلان عام کیا کرو اور اسے مسجدوں میں منعقد کرو''۔ یہ ترمذی کی روایت ہے۔
(۷۰)ڈاکٹر اسرار احمد، ایک اصلاحی تحریک مع خطبہ نکاح، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۸۔
(۷۱)''میثاق''، تنظیم اسلامی کا ترجمان رسالہ ہے جو ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔
(۷۲)ڈاکٹر اسرار احمد، ایک اصلاحی تحریک مع خطبہ نکاح، ص ۴۶، ۴۷۔
(۷۳)ایضاً، ص ۴۹، ۵۰۔ (۷۴)ایضاً، ص ۱۳۔

❁❁❁